شہید مرتضیٰ مطہری

سچی کہانیاں

حصہ اوّل

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

بسم الله الرحمن الرحيم

maablib.org

شہید مرتضیٰ مطہری

سچی کہانیاں

حصہ اوّل

maablib.org

نام کتاب : سچی کہانیاں

مؤلف : شہید مرتضیٰ مطہری

مترجم : ڈاکٹر سید اختر مہدی

نظر ثانی : حجت الاسلام سید مقصود علی رضوی

ناشر : شعبہ روابط بین الملل، سازمان تبلیغات اسلامی

کتابت : سید قلبی حسین رضوی

تعداد : ۵۰۰۰

بار دوم : رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ / جون ۱۹۸۵ء

طباعت : چاپ سپہر، تہران

فہرست

مقدمہ ۳

۱۔ رسول اکرمؐ اور مسلمانوں کے دو گروہ ۱۹

۲۔ ایک شخص جو مدد کا طالب تھا ۲۱

۳۔ دعا کی خواہش ۲۵

۴۔ اونٹ کی کمر باندھنا ۲۶

۵۔ ہمسفرِ حج ۲۸

۶۔ مجموعی غذا ۲۹

۷۔ ایک قافلہ جو حج کیلئے جا رہا تھا ۳۱

۸۔ مسلمان اور اہلِ کتاب ۳۴

۹۔ خلیفہ کی سواری کا احترام ۳۷

۱۰۔ امام باقرؑ اور ایک عیسائی ۳۹

۱۱۔ ایک عرب اور رسول اکرمؐ ۴۱

۱۲۔ مردِ شامی اور امام حسینؑ ۴۵

۱۳۔ ایک شخص جس نے نصیحت چاہی ۴۸

۱۴۔ ایک عیسائی اور علیؑ کی زرہ ۵۰

۱۵۔ امام صادقؑ اور صوفیا کا ایک گروہ ۵۲

۱۶۔ حضرت علیؑ اور عاصم ۷۴

۱۷۔ محتاج اور دولت مند ۷۸

۱۸۔ ایک راہی اور ایک دکان دار ۸۰

۱۹۔ غزالی اور کچھ لٹیرے ۸۳

۲۰۔ ابن سینا اور ابن مسکویہ ۸۷

۲۱۔ نصیحتِ زاہد ۸۹

۲۲۔ خلیفہ کے دربار میں ۹۲

۲۳۔ نمازِ عید ۹۶

۲۴۔ بچہ ماں کی دعا پر کان لگائے رہا ۱۰۳

۲۵۔ قاضی کے حضور میں ۱۰۵

۲۶۔ منیٰ کے میدان میں ۱۰۷

۲۷۔ وزن برداری کا مقابلہ ۱۰۹

۲۸۔ تازہ مسلمان ۱۱۱

۲۹۔ خلیفہ کا دسترخوان ۱۱۶

۳۰۔ پڑوسی کی شکایت ۱۱۹

۳۱۔ درختِ خرما ۱۲۱

۳۲۔ امِ سلمہ کے گھر میں ۱۲۴

۳۳۔ کالا بازار ۱۲۶

۳۴۔ قافلے سے بچھڑا ہوا ۱۲۹

۳۵۔ جوتے کا تسمہ ۱۳۳

۳۶۔ ہشام اور فرزدق	۱۳۵
۳۷۔ بزنطی	۱۴۱
۳۸۔ علیؑ کے مہمان عقیل	۱۴۴
۳۹۔ خوفناک خواب	۱۵۰
۴۰۔ ظلم بنی ساعدہ میں	۱۵۲
۴۱۔ یہودی کا سلام	۱۵۵
۴۲۔ ابوذر کے نام ایک خط	۱۵۷
۴۳۔ غیر معین مزدوری	۱۵۹
۴۴۔ آزاد ہے یا غلام	۱۶۲
۴۵۔ میقات میں	۱۶۵
۴۶۔ درخت کا بوجھ	۱۶۸
۴۷۔ محنت کا پسینہ	۱۶۹
۴۸۔ دوستی جو ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی	۱۷۰
۴۹۔ ایک گالی	۱۷۳
۵۰۔ شمشیرِ زبان	۱۷۸
۵۱۔ دو ساتھی	۱۸۰
۵۲۔ شرابی کی ہدایت	۱۸۳
۵۳۔ خلیفہ کا لباس	۱۸۵
۵۴۔ پریشان حال نوجوان	۱۸۷
۵۵۔ حبشہ کے مہاجرین	۱۸۹
۵۶۔ مزدور اور آفتاب	۲۰۰
۵۷۔ نیا پڑوسی	۲۰۱
۵۸۔ آخری کلام	۲۰۳
۵۹۔ نسیبہ	۲۰۵
۶۰۔ خواہشِ مسیحؑ	۲۰۹
۶۱۔ صحرا میں لکڑیوں کی فراہمی	۲۱۱
۶۲۔ دسترخوان پر شراب	۲۱۳
۶۳۔ سماعتِ قرآن کی خواہش	۲۱۵
۶۴۔ شہرتِ عام	۲۱۶
۶۵۔ جس بات سے ابوطالبؑ کو تقویت	۲۲۱
۶۶۔ بوڑھا طالب علم	۲۲۵
۶۷۔ ماہرِ علم نباتات	۲۲۹
۶۸۔ سخنور	۲۳۳
۶۹۔ طائف کے سفر کا پھل	۲۳۵
۷۰۔ ابواسحاق صابی	۲۴۱
۷۱۔ حقیقت کی تلاش میں	۲۴۳
۷۲۔ طالبِ یقین	۲۴۸
۷۳۔ ایک مشک بردوش پیاسا	۲۵۲
۷۴۔ مرتے ہوئے کو مارنا	۲۵۸
۷۵۔ انجان آدمی	۲۶۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

ان کہانیوں کی اشاعت کے زمانے میں اکثر احباب ومخلصین سے میں نے تذکرہ کیا کہ آج کل میں ایک ایسی کتاب کی تالیف میں معروف ہوں جو احادیث اور تاریخی کتابوں سے ماخوذ اور سچی داستانوں پر مشتمل ہے۔ حق وصداقت پر مبنی ان کہانیوں کی ترتیب میں انتہائی دلچسپ اسلوب بیان اور بالکل سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے تاکہ ہر خاص وعام شخص اس سے برابر کا فائدہ حاصل کرسکے میری باتوں کو سن کر لوگ اس کتاب کی تعریف کرنے لگتے تھے۔ بعض احباب نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ دراصل یہ کتاب نوجوان طبقے کے علاوہ آئندہ نسل کے لئے بھی بڑی مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ کچھ لوگوں نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ داستان نویسی کی دنیا میں اب تک کوئی ایسا کام منظر عام پر نہیں آیا جس میں احادیث اور کتب تاریخ کو ماخوذ قرار دیا گیا ہو۔ لہذا یہ کتاب اپنے نوعیت کی پہلی اور اچھوتی کوشش ہوگی۔ داستان نگاری کے میدان میں اس بات کی کمی کا احساس کیا جارہا تھا اور امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اس کمی کو پوری طرح دور کردے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی کتابوں کی تالیف عمل میں آچکی ہے جس میں اخلاقی اور اجتماعی حقائق کو عبارت کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی کتابیں بھی دیکھنے کو ملی ہیں جنہیں زندگی کی حقیقتوں کو مؤلف نے اپنے دلکش

انداز بیان اور فکری سجاوٹ کے ساتھ داستان کی صورت میں پیش کر دیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان داستانوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ ماہر فنکار کی حیثیت سے مؤلف نے زندگی میں رونما ہونے والے حقائق کی عکاسی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ عوام کو اس کا طرز بیان پسند آجائے۔ اس کے علاوہ سیرت کی کتابیں بھی ملتی ہیں جنہیں کسی ایک یا کئی بزرگ شخصیتوں کی زندگی کے حالات کو تاریخ کی صورت میں نقل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایسی کتابوں کو داستان کی فہرست میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ بہرحال میری نظروں سے بھی ایسی کوئی کتاب نہیں گذری جو احادیث اور تاریخ سے لی گئی مفید اور سچی داستانوں پر مشتمل ہو اور جس کی تالیف کا مقصد عوام کی ہدایت کے ساتھ ہی اسلامی اخلاق و تہذیب کی تبلیغ و ترویج ہو۔ اگر اسلامی اخلاق و تہذیب کی تبلیغ کے لئے کوئی کتاب لکھی گئی ہے تو وہ داستان کی صورت میں نہیں ہے اور اگر داستان کی صورت میں کوئی کتاب منظر عام پر آئی ہے تو اس کا ماخذ احادیث اور تاریخ نہیں ہے بلکہ اس میں مؤلف کی ماہرانہ طرز نگارش کو اجاگر کیا گیا ہے۔

بہرصورت یہ کتاب اپنے نوعیت کی پہلی اور اچھوتی کوشش ہے یا نہ ہو اس کا سہرا میرے سر نہیں ہے یعنی اگر یہ کتاب داستان نویسی کی دنیا میں ایک اہم ایجاد کی حیثیت رکھتی ہے تو اس کا موجد میں نہیں ہوں بلکہ نشر و اشاعت کے ایک ادارے میں ملک کے دانشور اور اہل علم اراکین پر ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل کی گئی تھی، ناچیز بھی اس بورڈ کا ایک رکن تھا۔ ملک کے نامور اہل قلم اور دانشمندوں پر مشتمل اس ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک اجلاس میں یہ تجویز رکھی گئی کہ ایک ایسی کتاب

کی تالیف کی جانی چاہئے جسمیں اخلاقی محاسن کو داستان کے انداز میں پیش کیا گیا ہو اور وہ داستانیں مولف کے ذہن کی ایجاد اور جعلی خیالات پر مبنی نہ ہوں بلکہ ان کا مأخذ احادیث اور سیرت وتاریخ کی کتابیں ہوں۔ اس تالیف کا مقصد اسلامی معاشرہ کی تربیت اور نوجوانوں کی ہدایت ورہنمائی تھا۔

مختصر یہ کہ تمام اراکین کی رائے سے یہ تجویز پاس ہوگئی۔ اس کام میں میرا صرف اتنا حصہ ہے کہ بورڈ کے دیگر اراکین کے مقابلے میں یہ تجویز مجھے زیادہ پسند آئی اور میں نے اسی وقت یہ عہد کرلیا کہ اس اہم ذمہ داری کو میں پورا کروں گا۔ چنانچہ "سچی کہانیاں" نامی یہ کتاب اس تجویز اور عہد کے نتیجے کی صورت میں آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

●

"سچی کہانیوں" میں شامل ہر داستان کے مأخذ و مدرک کو ہر صفحے کے حاشیہ پر نقل کردیا گیا ہے۔ ان میں بعض داستانیں ایک سے زیادہ کتابوں میں بھی ملتی ہیں چنانچہ انتہائی دیانت داری سے کام لیتے ہوئے ہر مأخذ کو حاشیہ میں لکھدیا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ مأخذ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات مدنظر رکھی گئی ہے کہ مختلف کتابوں میں ایک واقعہ کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے، ایک ہی واقعہ کو کسی نے مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے تو دوسرے مصنف نے اس واقعہ کا انتہائی تفصیل ذکر کیا ہے۔

واضح رہے کہ کسی بھی داستان کو بیان کرتے وقت خیال پردازی یا عبارت آرائی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مأخذ میں جو واقعہ جس طرح ہے اسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ اصل واقعہ میں نہ کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور نہ ہی اسمیں کسی قسم کی کمی کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ اس کتاب کو ایک سادہ اور

لفظی ترجمہ سمجھنا خلاف حقیقت ہوگا۔ بلکہ داستان نویسی کے وقت حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ اصل متن میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کے بغیر داستان کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے جس سے انسانی جذبات کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جاسکے اور قاری کی دلچسپی میں کوئی خرابی یا کمی نہ واقع ہونے پائے۔

چنانچہ اکثر داستانوں میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ ماخذ میں اس کو دوسری طرح شروع کیا گیا ہے اور اس کتاب میں اس کا آغاز کچھ اور ہے یا یہ کہ ماخذ میں جہاں داستان ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اس داستان کا آغاز وہی ہے۔ اس طرح اس کتاب کا طرز بیان بالکل مختلف ہے۔ لیکن اگر ایک حق پسند قاری داستان اور اس کے ماخذ دونوں کا مطالعہ کرے تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ یہ تصرفات کچھ اس طرح کئے گئے ہیں کہ داستان کی سچائی اور اس کی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آنے پائے بلکہ داستان کو اور زیادہ مقبول اور پسندیدہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں داستان سے حاصل ہونے والے نتائج کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی بلکہ ماخذ سے اس جملے کو منتخب کر لیا گیا ہے جس سے داستان کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور اس جملے کو بالکل اس کی اصلی صورت میں نقل کر دیا گیا ہے اور ہر داستان کا عنوان تلاش کرتے وقت حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایسا عنوان ہو جس سے کہانی سے حاصل ہونے والے نتیجے کا قطعی علم نہ ہو سکے۔ یہ سارا اہتمام اس مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ قاری خود ہی نتیجہ اخذ کرے۔

کسی کتاب یا عبارت کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والے کی فکر کو جھنجوڑ دے اور اور وہ عبارت میں پائی جانے والی گہرائی تک پہنچنے کے لئے فکری طور پر پوری طرح

آمادہ ہو جائے۔ عبارت آرائی کرتے وقت سادہ اسلوب بیان اور صاف و آسان زبان سے کام لینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں زیادہ غور و فکر نہ کرنی پڑے اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس عبارت کے مفہوم کو سمجھ لے۔ لیکن اس عبارت سے حاصل ہونے والے نتیجے کو قاری کی فکر کے حوالے کر دیا جانا چاہیے تاکہ اس کی فکری صلاحیتوں میں اضافہ ہو سکے۔ ہر وہ چیز جس کا نتیجہ قاری خود نہیں نکالتا اور اپنی فکر سے اسمیں کچھ اضافہ نہیں کرتا وہ اس کی روح کو متاثر نہیں کر پاتی۔ یعنی اگر قاری کسی بات کا نتیجہ خود ہی اخذ کرتا ہے تو اس کی فکر میں اضافہ کے ساتھ ہی وہ نتیجہ اس کی روح میں شامل ہو جاتا ہے اور اس نتیجے کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے اور جس چیز کا اثر دل پر ہوتا ہے وہ عملی صورت میں یقیناً رونما ہوا کرتا ہے۔ یعنی اپنی فکر سے حاصل ہونے والے نتیجے کا انسان کے عمل پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اپنی فکر سے حاصل ہونے والا نتیجہ فطری ہوا کرتا ہے چنانچہ اس سے انسانی فطرت کا متاثر ہونا یقینی ہے۔

●

جیسا کہ پہلے ہی سے طے کیا جا چکا تھا۔ اس کتاب میں شامل اکثر کہانیاں حدیث کی کتابوں سے لی گئی ہیں اور کہانی کا ہیرو اکثر دینی رہنما کو منتخب کیا گیا ہے لیکن یہ بات ہر ایک کہانی میں نہیں ہے بلکہ علم رجال پر مبنی کتابوں اور بزرگ دینی شخصیتوں کے حالات زندگی پر مشتمل تذکروں کے علاوہ کتب تاریخ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بلند مرتبہ علماء و دانشمندانِ اسلام سے متعلق ان داستانوں کو بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے جس سے اسلامی معاشرہ کی اصلاح کی جا سکے۔

اور جس کو پڑھ کر لوگ اعلیٰ اخلاقی محاسن سے بخوبی واقف ہو سکیں اور عمل کے میدان میں ان چیزوں کی پیروی بھی کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں بھی کسی قسم کی جانبداری یا تعصب سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ شیعی علماء و رہنماؤں کے علاوہ دیگر اسلامی اور غیر اسلامی اہم شخصیتوں سے متعلق واقعات کو بھی داستان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں۔

کتاب کا عنوان تلاش کرتے وقت اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ کہانیوں میں ہیرو کا کردار اکثر ایسی شخصیتوں نے ادا کیا ہے جن کی راست کرداری اور راست گفتاری میں کسی کو کلام نہیں ہے اور جنھیں خداوند قادر متعال کی مقدس کتاب قرآن مجید نے صدیقین کے لقب سے یاد کیا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا نام "سچی کہانیاں" رکھا گیا ہے۔ یعنی عرض کرنے کا یہ مقصد ہے، یہ کہانیاں ان حق پسند لوگوں کی ہیں جنھوں نے اپنی پوری حیات حق و صداقت اور صراط مستقیم کی پیروی اور تبلیغ کیلئے وقف کر رکھا تھا۔ اس عنوان سے دوسرا مفہوم یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ یہ کہانیاں ان لوگوں کیلئے ہیں جنھیں حق و صداقت پر چلنے کی خواہش اور جن کے دل میں یہ تڑپ ہے کہ سچے تذکروں سے اپنے اعمال کو صالح بنالیں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہانیاں سچے لوگوں کی ہیں اور سچے لوگوں کے لئے ہی لکھی گئی ہیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ، چونکہ یہ کہانیاں کسی انسان کے خیال کی ایجاد نہیں ہیں بلکہ ان واقعات پر مشتمل ہیں جو اس دنیا میں واقع ہوئے ہیں اور ایسی کتابوں میں درج کئے گئے ہیں جن میں کسی بھی واقعے کو بڑی امانت اور انتہائی صداقت کے پیش نظر درج کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ کہانیاں ہر اعتبار سے "سچی کہانیاں" کہلانے

کی مستحق ہیں۔ بہرحال اس کتاب میں شامل کہانیوں کو کسی طرح بھی سچائی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

●

اسمیں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ کہانیاں انسان کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں عملی رہنمائی کی خدمت انجام دینے میں بڑی سودمند ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہانیاں اسلامی تعلیمات کی روح کا تعارف بھی کراتی ہیں۔ یعنی ان کہانیوں کو پڑھکر قاری اسلامی تعلیمات کی روح سے بخوبی واقف ہوجاتا ہے اور اسلامی معارف سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد یہ کام بہت آسان ہوجاتا ہے کہ قاری اپنی ذاتی زندگی اور اس ماحول کا جائزہ لے اور یہ فیصلہ کرے کہ جس ماحول یا معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں۔ یوں تو کہنے کے لئے ہر طبقہ اپنے آپکو مسلمان کہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھا گیا ہے، ان میں سے بعض طبقے اسلام کے پرچم کو گلے میں لٹکائے گھوما کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح کہنے اور کرنے میں فرق ہوا کرتا ہے اسی طرح اسلام کا زبانی دعوی کرنے اور اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں بڑا فرق ہے۔ اسلام سے متعلق حقائق و معارف سے بخوبی آگاہی حاصل کرلینا اور عملی دنیا میں ان اصولوں پر کاربند رہنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ کہانیاں خواص کے لئے بھی اتنی ہی مفید و کارآمد ہیں جتنی عوام کے لئے لیکن اس کتاب کی تالیف کا اصل اور بنیادی مقصد عوام کو فائدہ پہونچانا ہے۔ کیونکہ صرف یہی وہ طبقہ ہے جو عدالت و انصاف اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہا کرتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ حق و صداقت

کی پیروی کے لئے کسی طرح کی حیلہ سازی یا بہانہ بازی سے کام نہیں لیتے بلکہ فوراً ہی اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔

انسانی سماج کے مختلف طبقے اچھائی اور برائی کے سلسلے میں یقیناً ایک دوسرے پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں اور اس بات کا قطعی امکان نہیں ہے کہ ان طبقوں کے درمیان ایسی دیوار قائم کی جائے جس کی وجہ سے ایک طبقے کی برائی کا دوسرے طبقے کے اوپر اثر نہ پڑ سکے۔ لیکن اب تک کا معمول یہی رہا ہے کہ فساد یا خرابی ہمیشہ طبقۂ خواص سے ہی شروع ہوتی ہے اور بعد میں یہ خرابی طبقۂ عوام میں بھی پھیل جاتی ہے اس کے برعکس ہر قسم کی سماجی بھلائی اور بیداری کا سلسلہ طبقۂ عوام سے شروع ہوا کرتا ہے اور بعد میں طبقۂ خواص کو اس بات کے لئے مجبور کر دیا کرتا ہے کہ وہ اس عمل صالح کی پیروی کرے۔ یعنی حسب معمول فساد اوپر سے نیچے کی طرف گرتا ہے اور صلاح نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سماج میں پھیلی ہوئی خرابی اور بدعنوانی پر نگاہ پڑتے ہی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس خرابی کی بنیاد طبقۂ خواص نے ہی رکھی ہے اور دھیرے دھیرے یہ خرابی عام لوگوں میں پھیل کر خطرناک اور تباہ کن صورتحال اختیار کر گئی۔ اسی طرح سماجی فلاح و بہبود کے سلسلے کا ہر کام طبقۂ عوام سے شروع ہوا کرتا ہے۔ اور ایک ایسی منزل آجاتی ہے کہ طبقہ خواص کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ عوام کے پروگرام میں شریک ہو جائیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ارشادات عالیہ میں انسانی سماج کو دو طبقے میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عام لوگوں کا طبقہ ہے اور دوسرا خاص لوگوں کا۔ انہوں نے طبقۂ خواص سے کسی قسم کے نیک کام یا صراط مستقیم کی

پیروی کے سلسلے میں ناامیدی اور مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے برخلاف طبقۂ عوام ہی ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اپنے دور حکومت میں مالک اشتر کے نام جاری کردہ ایک فرمان میں امیرالمومنین یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"گورنر کو معلوم رہنا چاہئے کہ بیکاری میں بہت زیادہ خرچ کرنے والا، مصائب میں کم امداد کرنے والا، عدالت و انصاف سے زیادہ نفرت کرنے والا، بڑی بڑی امیدیں رکھنے والا، حصول نعمت کے موقع پر شکریہ ادا کرنے والا، کسی قسم کا عذر نہ قبول کرنے والا اور دوسروں سے کم طاقت رکھنے والا طبقہ خاص لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس طبقے سے بڑھ کر کسی دوسرے شخص میں نہ ملیں گی۔ اس کے برخلاف سماج کا عام طبقہ ہی در اصل دین کا پشتواز ہوا کرتا ہے۔ بے شک عام لوگوں پر مشتمل طبقہ ہی مسلمانوں کے درمیان مرکزی حیثیت کا حامل اور دشمنان اسلام کے مقابلے میں کامیابی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ پس اے مالک! تم کو طبقۂ عوام کا ہمیشہ اور بھرپور خیال رکھنا چاہئے۔"

چنانچہ یہ خیال کرنا قطعی غلط ہے کہ صرف مٹھی بھر خاص لوگوں کی حمایت کے ذریعہ بڑے سے بڑا اصلاحی کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اور ان معدودے چند لوگوں کی طرفداری کے ذریعہ ترقی کی بلند ترین منزلیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

بلکہ تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ معمولاً اونچے اونچے محلوں سے شروع کیا جانے والا ہر پروگرام بظاہر مفید اور کارآمد نظر آتا ہے۔ اس پروگرام میں پائی جانے والی خوبی کی زبردست اور مبالغہ آمیز تبلیغ اور پبلسٹی کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام پروپگنڈہ ڈھول میں پول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عوام کی حمایت میں شروع کئے جانے والے پروگرام میں پروپگنڈہ کے بجائے خلوص و عقیدت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ہر آدمی انتہائی خلوص و محنت کے ساتھ اپنے کام میں پوری طرح معروف نظر آتا ہے

●

بات آگئی ہے تو عرض کرتا چلوں کہ جس وقت میں اس کتاب کی تالیف و اشاعت کے کاموں میں معروف تھا، میرے احباب و مخلصین نے اس کتاب کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجھے بے شمار خط ارسال کئے۔ تقریباً سبھی لوگوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ یہ کتاب اسلامی معاشرہ کے لئے انتہائی سود مند ثابت ہوگی۔ لیکن ان میں سے بعض لوگوں نے یہ تحریر کیا تھا کہ ان کے خیال میں مجھ جیسے عالم کو یہ بات زیبا نہیں دیتی کہ دیگر اہم کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام چھوڑ کر مختصر داستانوں پر مشتمل اس کتاب کی ترتیب کا کام انجام دوں ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے مکتوب میں اظہار افسوس کے ساتھ مجھے بہت برا بھلا بھی کہا کہ ان کی نظر میں گرانقدر علمی کتابوں کی تالیف کو وقتی طور پر روک کر کسی معمولی اور سادہ کتاب کی تالیف کسی طرح بھی موزوں اور مناسب نہیں۔ ان میں سے کچھ دوستوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ خیر اگر آپ نے داستانوں

پر مشتمل کتاب کی تالیف کی دشواری برداشت کر لی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر اسے اپنے نام سے شائع نہ کریں تو بہتر ہوگا ۔ میں نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ آخر ایسا کیوں ؟ آخر اس میں کیا مضائقہ ہے اگر میں اسے اپنے نام سے ہی شائع کروں ! ان لوگوں نے جواب دیا کہ آپ جیسے بلند مرتبہ فلسفی اور عالم کے شایانِ شان نہیں ، معلوم ہوتا کہ اس قسم کے چھوٹے اور کم اہمیت کام آپ کے نام سے شائع ہوں ۔ جب میں نے چھوٹے اور بڑے کام کا معیار معلوم کیا تو پتہ چلا کہ مشکل تراکیب اور اور عالمانہ اصطلاحات پر مشتمل تالیف بڑے کام کی فہرست میں آتی ہے اور سادہ عبارت و عام فہم زبان میں لکھی گئی کتاب معمولی اور چھوٹا کام ہوا کرتا ہے ۔ یعنی بزرگی اور کوچکی کا معیار کام کی اہمیت سے قطعی مربوط نہیں ہے بلکہ کلیہ یہ ہے کہ سادہ کام چھوٹا اور مشکل کام بڑا ہوا کرتا ہے ۔

اگر یہ منطق یا طرز فکر صرف ایک یا چند لوگوں کی ذہنی اختراع ہوتی تو میں اس بات کا تذکرہ ہرگز نہ کرتا ۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ طرز فکر ایک خوفناک سماجی بیماری کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور اسے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں زبردست انحراف کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ اس طرز فکر نے بے شمار اہل قلم کو ایسی مایوسی اور احساس کمتری کا شکار بنا دیا کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہی ترک کر دیا ۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم دینی اور مفید مذہبی کتابوں کے میدان میں حد سے زیادہ فقیر ہیں اور ایسی گرانقدر کتابیں کسی حد تک بالکل ہی نایاب ہیں جس سے مسلمان استفادہ کر سکے ۔ بلند مرتبہ عالم و فاضل کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ

دس برس تک یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کسی ایک موضوع پر ایک علمی کتاب تالیف کرے اور پھر اس کی پشت پر سونے حروف سے اپنا نام لکھ کر شایع کرے۔ اب یہ اور بات ہے کہ چاہے۔ اس موٹی کتاب سے معاشرہ کا کوئی ایک آدمی بھی استفادہ نہ کر سکے مگر معیاری اعتبار سے وہ بہت بڑا اور گرانقدر کام شمار کیا جائے گا۔ لیکن وہی عالم ایک انتہائی مفید کتاب صاف اور سادہ زبان میں صرف اس وجہ سے شائع نہیں کرتا کہ یہ اس کے شایانِ شان نہیں ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تالیف و اشاعت نہیں ہو پاتی اور جن چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے کیا خوب لکھا ہے۔

افسوس کہ آنچہ بردہ ام باختنی است
شناختہ ہا تمام ناشناختنی است
برداشتہ ام ہر آنچہ باید بگذاشت
بگذاشتہ ام ہر آنچہ برداشتنی است

"یعنی افسوس کہ جو بازی مجھے ہارنی چاہئے اس میں میں نے کامیابی حاصل کرلی اور جن چیزوں کو مجھے نہ پہچاننا چاہئے ان کی معرفت حاصل کرلی۔ مختصر یہ کہ جو چیزیں مجھے چھوڑ دینی چاہئے انہیں میں نے اپنے گلے لگا رکھا ہے اور اور جو چیزیں مجھے حاصل کرنی چاہئے انہیں ترک کر دیا ہے۔"

آخر کار میں نے اپنے مخلص دوستوں کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ تمہاری اس تجویز نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ سماج میں پھیلی ہوئی اس مہلک بیماری کا تذکرہ بھی کردوں جس نے اسلامی تعلیمات کے تبلیغی مشن کو انحراف سے دوچار کر رکھا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مجھے آپکی یہ تجویز ناقابل قبول ہے اور میں اس سادہ کتاب کو اپنے ہی نام سے شائع کروں گا بلکہ اس کتاب کے مقدمہ میں اسلامی معاشرہ کو دامنگیر اس خطرناک بیماری کا بھی تذکرہ کروں گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ خیال میرے ذہن کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ جس طرح لوگ سادہ اور آسان کتابوں کی تالیف واشاعت کو کسر شان پر محمول کرتے ہیں، ہمارے معاشرے میں یقیناً ایسے افراد بھی ضرور ہوں گے جو سادہ اور آسان جملوں میں لکھی گئی علم و حکمت پر مبنی کتاب کا مطالعہ بھی یہ سوچ کر نہ کرتے ہوں گے کہ اس قسم کی چھوٹی کتابوں کا مطالعہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔

●

قرآن مجید کی قدر و منزلت اور حرمت و تقدس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے میں نے قصداً اس مقدس کتاب میں پائی جانے والی داستانوں کو اس کتاب میں نہیں شامل کیا۔ میرا عقیدہ و ایمان رہا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں پائی جانے والی اہم داستانوں پر ایک علیحدہ اور جامع کتاب شائع کی جانی چاہئے اور اس کی داستانوں کو کسی دوسری کتاب میں شامل نہ کیا جانا ہی بہتر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کا کام عربی زبان میں بہت کیا گیا تھا لیکن فارسی میں بھی اس موضوع پر کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

دس برس تک یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کسی ایک موضوع پر ایک علمی کتاب تالیف کرے اور پھر اس کی پشت پر موٹے حروف سے اپنا نام لکھ کر شائع کرے. اب یہ اور بات ہے کہ چاہے۔ اس موٹی کتاب سے معاشرہ کا کوئی ایک آدمی بھی استفادہ نہ کر سکے مگر معیاری اعتبار سے وہ بہت بڑا اور گرانقدر کام شمار کیا جائے گا۔ لیکن وہی عالم ایک انتہائی مفید کتاب صاف اور سادہ زبان میں صرف اس وجہ سے شائع نہیں کرتا کہ یہ اس کے شایان شان نہیں ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تالیف و اشاعت نہیں ہو پاتی اور جن چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں خواجہ نصیر الدین طوسی نے کیا خوب لکھا ہے۔

افسوس کہ آنچہ بردہ ام باختنی است
شناختہ ہا تمام ناشناختنی است
برداشتہ ام ہر انچہ باید بگذاشت
بگذاشتہ ام ہر انچہ برداشتنی است

"یعنی افسوس کہ جو بازی مجھے ہار جانی چاہیے اس میں میں نے کامیابی حاصل کرلی اور جن چیزوں کو مجھے نہ پہچاننا چاہیئے ان کی معرفت حاصل کرلی۔ مختصر یہ کہ جو چیزیں مجھے چھوڑ دینی چاہیئے انھیں میں نے اپنے گلے لگا رکھا ہے اور اور جو چیزیں مجھے حاصل کرنی چاہیئے انھیں ترک کر دیا ہے۔"

آخر کار میں نے اپنے مخلص دوستوں کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ تمہاری اس تجویز نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ سماج میں پھیلی ہوئی اس مہلک بیماری کا تذکرہ بھی کردوں جس نے اسلامی تعلیمات کے تبلیغی مشن کو انحراف سے دوچار کر رکھا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ مجھے آپکی یہ تجویز ناقابل قبول ہے اور میں اس سادہ کتاب کو اپنے ہی نام سے شائع کروں گا بلکہ اس کتاب کے مقدمہ میں اسلامی معاشرہ کو دامنگیر اس خطرناک بیماری کا بھی تذکرہ کروں گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ خیال میرے ذہن کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ جس طرح لوگ سادہ اور آسان کتابوں کی تالیف و اشاعت کو کسر شان پر محمول کرتے ہیں، ہمارے معاشرے میں یقیناً ایسے افراد بھی ضرور رہے ہوں گے جو سادہ اور آسان جملوں میں لکھی گئی علم و حکمت پر مبنی کتاب کا مطالعہ بھی یہ سوچ کر نہ کرتے ہوں گے کہ اس قسم کی چھوٹی کتابوں کا مطالعہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔

●

قرآن مجید کی قدر و منزلت اور حرمت و تقدس کو نگاہ میں رکھتے ہوئے میں نے قصداً اس مقدس کتاب میں پائی جانے والی داستانوں کو اس کتاب میں نہیں شامل کیا۔ میرا عقیدہ و ایمان رہا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں پائی جانے والی اہم داستانوں پر ایک علیحدہ اور جامع کتاب شائع کی جانی چاہئے اور اس کی داستانوں کو کسی دوسری کتاب میں شامل نہ کیا جانا ہی بہتر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کا کام عربی زبان میں بہت کیا گیا تھا لیکن فارسی میں بھی اس موضوع پر کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

بہرحال اس حقیقت کا اعتراف لازمی ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کے بعد ہی اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا کس حد تک مبالغہ نہ ہوگا کہ قرآن مجید ہی نے راقم الحروف کو ایسی کتاب کی تالیف پر مجبور کردیا جو آسان کہانیوں کے ذریعہ انسانی معاشرہ کی اصلاح کر سکے۔ اہل علم و معرفت سے یہ بات قطعی پوشیدہ نہیں ہے کہ قرآن مجید وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسانی معاشرہ کی ہدایت و رہنمائی کو مدنظر رکھتے ہوئے "سچی کہانیوں" کو اپنے قالب میں جگہ دی ہے اور اسے الٰہی تعلیمات کا جز قرار دیا ہے۔

●

"سچی کہانیاں" پہلی جلد ۵۰ داستانوں پر مشتمل ہے۔ میں نے پہلے اس جلد کے لئے سو داستانوں کا انتخاب کیا تھا اور یہ خیال تھا کہ آئندہ جلدیں بھی سو کہانیاں شامل کروں گا۔ لیکن احباب مخلصین کے علاوہ نشر و اشاعتی کمپنی کے ایڈیٹوریل بورڈ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ سو کہانیوں کی وجہ سے کتاب کا حجم کافی بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ کتاب کی اشاعت کے لئے جو کاغذ فراہم کیا گیا تھا وہ بھی کم تھا۔ بہرحال ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ پہلی جلد ۵۰ کہانیوں کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شامل زیادہ تر کہانیاں مثبت پہلو کی حامل ہیں۔ پوری کتاب میں صرف دو تین کہانیاں ایسی ہیں جن سے منفی پہلو نکلتا ہے۔ یعنی یہ دو تین کہانیاں حکیم لقمان کے اس کلیہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اگر کسی شخص میں کوئی

اخلاقی کمزوری نظر آئے تو اس شخص کی اصلاح اور تنبیہ کی غرض سے اس کمزوری یا خرابی کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر "ایک گالی" "شمشیر زبان" اور دوستی جو ختم ہو گئی" نامی کہانیاں منفی پہلو کی حامل کہی جا سکتی ہیں۔ پہلے میں بغیر کسی خاص توجہ کے ان تمام کہانیوں کو لکھتا چلا گیا لیکن ترتیب کے وقت جب ان کہانیوں پر نظر پڑی تو فوراً خیال آیا کہ انھیں اس کتاب میں نہ شامل کروں تاکہ سب کہانیاں ایک جیسی رہ جائیں اور مثبت پہلو ہی کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کا کام شروع کیا جائے۔ ایک طویل مدت تک یہ نہ طے پا یا کہ ان داستانوں کو اس کتاب میں شامل کروں یا نہ کروں۔ آخر کار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کہانیوں کو کتاب میں شامل رہنے دیا جائے۔ اور کتاب کے مقدمہ میں قارئین کی توجہ ان داستانوں کی طرف مبذول کرا کر ان سے مشورہ لیا جائے کہ اس قسم کی کہانیوں کے بارے میں آخر ان کے خیالات کیا ہیں۔ اور قارئین کرام کی رائے پر آئندہ جلدوں میں اس قسم کی داستانوں کی شمولیت کے بارے میں فیصلہ کیا جانا ہی بہتر ہو گا۔

●

میں آپ تمام حضرات کی رہنمائی اور تنقید کا نیاز مند ہوں انتقاد و اصلاح سے متعلق قارئین محترم کے ہر مفید مشورے کے لئے انتہائی شکر گزار ہوں گا۔ ان کا مفید مشورہ ہماری آئندہ جلدوں کو بہتر بنانے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہو گا۔

خداوند قادر متعال کی بارگاہ عالیہ سے سعادت و توفیق کا طالب ہوں۔

مرتضیٰ مطہری

تہران - ۱۵ محرم الحرام ۱۳۸۰ھ

maablib.org

①

رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں کے دو گروہ

رسولؐ مقبول مسجد مدینہ[1] میں داخل ہوئے تو انکی نگاہ مسلمانوں کے ان دو گروہوں پر پڑی جو حلقہ بنائے ہوئے کسی کام میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک جماعت عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف تھی اور دوسرا گروہ تعلیم و تعلم اور سیکھنے سکھانے میں سرگرم تھا۔ پیغمبر اسلام دونوں جماعتوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے قریب کھڑے ہوئے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "یہ دونوں گروہ نیک کام میں مصروف ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں گروہ میں شامل افراد نیکی اور سعادت پر گامزن ہیں۔" اس کے بعد آنحضرتؐ نے اپنی گفتگو کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

[1] صدر اسلام میں مسجد مدینہ کا استعمال صرف فریضۂ نماز کی ادائیگی ہی کے لئے نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس دور کے مسلمانوں کی جملہ سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بھی مسجد تھی۔ جس وقت ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی قسم کا اجتماع کیا جائے تو لوگوں کو اسی مسجد میں جمع ہونے کی دعوت دیدی جاتی تھی۔ اور لوگ وہاں جمع ہوکر ہر قسم کی اہم اطلاعات حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ہر طرح کے نئے فیصلے اسی مسجد میں کئے جاتے تھے اور اس کے بعد اس کا اعلان بھی کر دیا جایا کرتا تھا تاکہ لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں۔ مسلمان جب تک مکہ میں رہے ہر قسم کی سماجی سرگرمی اور آزادی سے پوری طرح محروم تھے۔ نہ مذہبی اعمال و فرائض کو آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے اور نہ ہی انھیں دینی تعلیمات حاصل کرنے کی آزادی تھی۔ یہ صورت حال کافی دنوں تک قائم رہی یہاں تک کہ اسلام نے عربستان کے ایک دوسرے علاقے پر اپنا اثر جما لیا جس کا نام یثرب تھا اور جو بعد میں مدینۃ النبی یعنی نبیؐ کا شہر

"لیکن میں لوگوں کی تعلیم اور انھیں عقلمند بنانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔" یہ جملہ ادا کرتے ہوئے رسول مقبولؐ اس جماعت کی طرف بڑھ گئے جو تعلیم و تعلّم اور سیکھنے سکھانے میں معروف تھی۔ وہاں پہونچکر وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ پوری طرح سرگرم ہو گئے۔[۲]

کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رسول مقبولؐ نے شہر مدینہ کے لوگوں کی تجویز پر اور ان کے عہد و پیمان کو مدنظر رکھتے ہوئے مکہ سے ہجرت اختیار کر لی۔ دھیرے دھیرے سارے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ گئے اور اس وقت سے مسلمانوں کو اس بات کی آزادی مل گئی کہ وہ اپنی مذہبی سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لیں شہر مدینہ پہونچنے کے بعد رسول مقبولؐ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک معقول جگہ کا انتخاب کر کے اپنے اصحاب کی مدد سے اس مسجد کی تعمیر کا کام پورا کیا۔

[۲] منیۃ المرید۔ چاپ بمبئی ص۵

۲

ایک شخص جو مدد کا طالب تھا

وہ جب کبھی اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتا تو اسے فوراً ہی یاد آجاتا تھا کہ اس نے کس قدر تلخ اور مصائب میں ڈوبے ہوئے دن بسر کئے ہیں۔ یہ وہ برے دن تھے جب اس کی اتنی بھی حیثیت نہ تھی کہ اپنے بیوی بچوں کو پیٹ بھر غذا فراہم کر سکے۔ اور اس کے معصوم بچے بھوک کی آگ میں جھلستے رہتے تھے۔ پھر وہ دل ہی دل میں اس ایک جملے کے بارے میں غور و فکر کیا کرتا تھا جو اس کی ذہنی بیداری کا سبب قرار پایا۔ وہ ایک جملہ جس نے اس کی روح کو غیر معمولی قوت عطا کر دی۔ وہ ایک جملہ جس نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا اور اس کی زبوں حالی خوشحالی میں تبدیل ہوگئی۔ کل جو گھرانہ انتہائی فقر و فاقہ اور بے سروسامانی کی شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا وہ آج اس ایک جملے کی برکت سے انتہائی پرسکون زندگی بسر کرنے لگا۔

وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ رسول مقبولؐ کا ایک صحابی تھا۔ فقیری اور تنگدستی اس پر پوری طرح غالب تھی۔ ایک روز جب وہ دنیاوی پریشانیوں سے بہت تنگ آگیا تو اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا کہ تم اپنی زبوں حالی کا تذکرہ

رسول مقبولؐ سے کرو۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ وہ رسولؐ کی خدمت میں اپنا پورا حال کہہ سنائے گا اور ان سے مالی امداد بھی طلب کرے گا۔

چنانچہ اس ارادے کے ساتھ وہ خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا۔ لیکن طلب حاجت سے قبل ہی اس نے رسول مقبولؐ کی زبان سے یہ جملہ سنا: "جو شخص ہم سے مدد کا طالب ہوگا ہم یقیناً اس کی امداد کریں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی مخلوق کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بے نیازی اختیار کرتا ہے تو خالق کائنات اس کو واقعی بے نیاز کر دیا کرتا ہے۔" یہ جملہ سننے کے بعد وہ شخص رسولؐ مقبول کی خدمت میں کچھ نہ عرض کر سکا اور واپس لوٹ آیا۔ گھر پہونچکر کیا دیکھا ہے کہ پہلے ہی جیسا فقر و فاقے کا ماحول طاری ہے۔ مجبوراً دوسرے دن اسی ارادے کے ساتھ وہ خدمت رسولؐ میں پھر حاضر ہوا۔ اس دن بھی اس نے رسول مقبولؐ کی زبان سے وہی جملہ سنا کہ "جو شخص ہم سے مدد کا طالب ہوگا۔ ہم یقیناً اسکی مدد کریں گے لیکن اگر کوئی شخص کسی مخلوق کے سامنے دست سوال پھیلانے سے بے نیازی اختیار کرتا ہے تو خالق کائنات اس کو واقعی بے نیاز کر دیا کرتا ہے۔" اس بار بھی وہ اپنی حاجت بیان کئے بغیر گھر واپس لوٹ آیا۔ لیکن گھر پر چھائی ہوئی بے سروسامانی اور غیر معمولی مصائب روزگار نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ دوبارہ طلب حاجت کا ارادہ لئے ہوئے خدمت رسولؐ میں پہونچ گیا۔ اس بار پھر رسولؐ مقبول کے ہونٹ حرکت میں آئے اور انہوں نے اپنے پہلے جیسے مخصوص لہجے میں وہی جملہ پھر دہرایا۔

اس بار رسولِ مقبولؐ کے جملے کو سن کر اس شخص کو غیر معمولی سکون ملا
اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ جملہ ہی اس کی تمام پریشانیوں کو دور کرنے کی کنجی
ہے۔ اس دفعہ جب وہ خدمتِ رسولؐ سے اٹھ کر جانے لگا تو اسے بے پناہ
سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا اپنے
گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ وہ اپنے دل میں یہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اب
آئندہ کسی شخص کے سامنے [illegible] اگر سوال ہی کرنا ہے تو اپنے
پروردگار سے [illegible] قوت بازو سے کام
لوں گا جو [illegible] دگار سے دعا
کروں گا [illegible] طرح سے
بے نیاز بنا [illegible]

[illegible]

ہوں؟ فور [illegible]
بازار میں فروخ [illegible]
کی طرف چل [illegible]
اسے لا کر [illegible]

معلوم ہوا [illegible]
اس نے اپنی آمدنی سے [illegible]
نے کچھ جانور اور دیگر گھر [illegible]
کاٹ کر اسے فروخت کرنے برابر [illegible]

تاجر بن گیا اور غلام وغیرہ بھی رکھ لیئے۔

ایک روز رسول مقبولؐ اس شخص کے پاس گئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ جو شخص ہم سے مدد چاہتا ہے، ہم اس کی مدد ضرور کریں گے۔ لیکن اگر کسی شخص نے بے نیازی سے کام لیا تو پروردگار عالم اسے یقیناً بے نیاز بنا دے گا۔ [1]

---

[1] اصول کافی جلد دوم صفحہ ۱۳۹ ۔ باب القناعۃ و سفینۃ البحار مادۂ "قنع"

maablib.org

(۳)

دُعا کی خواہش

ایک شخص نہایت اضطراب و پریشانی کے عالم میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔

"میں بہت غریب اور فقیر آدمی ہوں۔ آپ میرے لئے دعا کر دیں تاکہ پروردگار عالم میرے رزق میں وسعت دیدے اور مجھے تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے۔"

امام نے ارشاد فرمایا: "میں تیرے لئے ہرگز دعا نہ کروں گا"۔

اس شخص نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: اے امامؑ! آخر کیا وجہ ہے کہ آپ میرے لئے دعا نہیں کریں گے۔؟

امامؑ نے جواب دیتے ہوئے کہا: "تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پروردگار عالم نے اس کام کیلئے ایک راستہ معین کر رکھا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تلاش معاش کے لئے گھر سے باہر نکل پڑو اور محنت سے کام لو اور تو یہ چاہتا ہے کہ گھر سے باہر نکل کر تلاش معاش کے بجائے دعا کے زور سے روزی کو اپنے گھر ہی بلائے۱"

۱ وسائل۔ چاپ امیر بہادر جلد دوم ص ۵۲۹

④

اونٹ کی تسمہ باندھنا

قافلہ لمبی مسافت طے کر چکا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ جانور بھی تھک کر چور ہو چکے تھے۔ یہاں تک یہ لوگ ایک ایسی جگہ پر پہونچ گئے جہاں پانی موجود تھا چنانچہ اسی جگہ قافلے کو روک دیا گیا رسول مقبولؐ بھی اس قافلے کے ساتھ تھے۔ تمام قافلے والوں کی طرح وہ بھی اپنے اونٹ سے نیچے اتر آئے۔ ہر آدمی کی یہی کوشش تھی جلدی سے جلدی وہ چشمۂ آب تک پہونچ جائے اور وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے آپ کو نماز کے لئے آمادہ کرے۔

رسول مقبول بھی سواری سے نیچے اترنے کے بعد چشمۂ آب کی طرف چل پڑے۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد وہ بغیر کسی سے کچھ بتائے ہوئے واپس لوٹ پڑے اور اپنے مرکب کی طرف بڑھنے لگے۔ اصحاب اور یاران رسول انتہائی تعجب کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ شاید یہ جگہ پیغمبر اسلام کو پسند نہیں آئی۔ اور وہ پھر چل پڑنے کا حکم صادر کرنے والے ہیں۔ سب کی

نگاہیں رسولؐ اکرم پر لگی ہوئی تھیں اور ہر شخص نیا فرمان سننے کے لیے رسولؐ کی آواز پر اپنا کان لگائے ہوئے تھا۔ سب لوگ اس وقت اور زیادہ حیران ہو گئے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ نے کمر بند اٹھایا اور اپنے اونٹ کی کمر باندھنا شروع کر دیا۔ جلدی اس کام سے فارغ ہو کر وہ چشمۂ آب کی طرف لوٹ پڑے۔

چاروں طرف سے لوگوں نے فریاد شروع کر دی: "اے اللہ کے رسولؐ! آخر آپ نے ہم لوگوں کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ اس خدمت کا شرف ہمیں حاصل ہو جاتا۔ آپ نے بلاوجہ اتنی تکلیف اٹھائی اور اس کام کے لئے دوبارہ لوٹ کر گئے۔ ہم تو بڑے فخر کے ساتھ اس کام کے لئے ہمہ تن آمادہ تھے۔"

پیغمبر اسلام نے ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اپنے کام میں کبھی دوسروں کی مدد لینا چاہئے اور نہ ہی دوسروں پر بھروسہ کرنا چاہئے چاہے ایک مسواک ہی کیوں نہ لانی ہو۔ یعنی چاہے چھوٹا کام ہو یا بڑا کسی دوسرے پر بھروسہ کرنے کے بجائے اسے خود ہی انجام دینا چاہیے۔"[1]

---

[1] لا یستعن احدکم من غیرہ ولو بقضمۃ من سواک۔ کحل البصر۔ محدث قمی ص ۶۹

۵

ہمسفرِ حج

حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد ایک شخص اپنی اور اپنے ساتھیوں سے متعلق روداد سفر امام جعفر صادق علیہ السلام کو سنا رہا تھا۔ خصوصاً وہ اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کی بڑی تعریف کر رہا تھا، کہنے لگا کہ واقعی وہ شخص بڑا متقی اور زبردست عبادت گزار تھا اور ہر وقت معبود حقیقی کی عبادت میں مصروف رہا کرتا تھا جیسے ہم لوگ کسی جگہ پر رات بسر کرنے کیلئے قافلہ روکتے تھے وہ شخص سواری سے نیچے اتر کر ایک گوشے میں چلا جاتا تھا اور فوراً ہی سجادہ پھیلا کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جایا کرتا تھا۔

امام نے اس شخص سے دریافت کیا: "پس اس کے دوسرے کام کون انجام دیتا تھا؟ اس کے جانور کی دیکھ بھال کون کرتا تھا؟

اس نے جواب دیا: "ظاہر سی بات ہے کہ ان تمام خدمات کا شرف ہم لوگوں کو حاصل تھا۔ وہ تو صرف اپنے مقدس کاموں میں ہی مصروف رہا کرتے تھے۔ انھیں عبادت کے علاوہ اس قسم کے کاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔"

امام نے جواب دیتے ہوئے کہا: "یہی وجہ ہے کہ تم سب لوگ اس مرد متقی و عبادت گذار سے زیادہ اچھے رہے۔"

(٦)

مجموعی غذا

رسولؐ مقبول اوران کے اصحاب اپنی سواریوں سے نیچے اترے اور سب نے سامان سفر کھول دیا۔ اس کے بعد سب لوگوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ایک گوسفند کو ذبح کر کے اس کا گوشت تیار کیا جائے۔

ایک صحابی نے کہا، "گوسفند کا سر کاٹنا میرے ذمہ ٹھہرا۔"

دوسرے نے کہا: "اس کی کھال آتارنا میرے حصے میں۔"

تیسرے نے کہا: "گوشت پکانا میری ذمہ داری قرار پائی۔"

رسولؐ مقبول بولے: گوشت پکانے کے لئے جنگل سے لکڑیاں جمع کرنا میرے ذمہ۔

سبھی اصحاب ایک ساتھ کہہ اٹھے۔ "یا رسول اللہؐ! ہم لوگوں کی موجودگی میں آپکو زحمت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ آرام فرمائیں ہم لوگ بڑی آسانی اور فخر کے ساتھ یہ تمام کام بخیر و خوبی انجام دیں گے۔

رسولؐ مقبول نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ یہ سب کام بڑی آسانی سے کر لوگے۔ لیکن خداوند عالم اپنے اس بندے کو قطعی دوست نہیں رکھتا جو دوستوں کے درمیان اپنے آپ کو افضل اور دوسروں سے

بہتر سمجھتا ہے۔ اور دوسروں کے مقابلے میں خود کو صاحب امتیاز تصور کرتا ہے۔[1]

یہ کہہ کر رسول اکرمؐ جنگل کی طرف چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد لکڑیاں اور گھاس پھوس لے کر واپس آگئے۔[2]

۱۔ ان اللّٰہ یکرہ من عبدہ ان یراہ متمیزاً بین اصحابہ

۲۔ کحل البصر۔ ص ۶۸

maablib.org

(۷)

ایک قافلہ جو حج کے لئے جارہا تھا

مسلمانوں کا ایک قافلہ مکہ جارہا تھا۔ مدینہ پہونچتے ہی قافلے والے کچھ دنوں کے لئے وہاں ٹھہر گئے۔ چند روز کی استراحت کے بعد یہ لوگ مدینے سے مکہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ اہل قافلہ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو سبھی قافلے والوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ شخص ابھی قافلے والوں سے گفتگو میں محو تھا کہ اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ تمام قافلے والوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ اس آدمی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ نہایت خوشی خوشی لوگوں کی خدمت کرنے والا شخص کون ہے چنانچہ اس نے بڑی حیرت کے ساتھ قافلے والوں سے دریافت کیا "تم لوگ اس شخص کو پہچانتے ہو جو تمہاری خدمت میں لگا ہوا ہے؟" ان لوگوں نے جواب دیا۔ "نہیں ہم لوگ اس آدمی کو بالکل نہیں پہچانتے۔ یہ شخص تو مدینے سے ہمارے قافلے کے ساتھ ملحق ہوگیا۔ بس ہم کچھ دنوں کی سفر کی رفاقت سے اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص صالح اور انتہائی متقی و پرہیزگار ہے۔ ہم لوگوں نے اس سے کہا بھی نہیں کہ ہمارا کام کردو مگر وہ

خود ہی دوسروں کی خدمت میں مصروف ہے اور ہر آدمی کی مدد کر رہا ہے۔

"قافلے والوں کے دوست نے کہا: " مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ انھیں بالکل نہیں پہچانتے۔ اگر تم لوگ انھیں پہچان لیتے تو کبھی ایسی گستاخانہ حرکت نہ کرتے کہ ایک معمولی خادم کی طرح تم لوگوں کے کام انجام دیتا رہے۔

سب لوگوں نے بڑی تعجب سے پوچھا:۔" آخر یہ شخص کون ہے؟"

وہ بولا۔" یہ علی ابن الحسینؑ یعنی امام زین العابدینؑ ہیں۔"

یہ سنتے ہی قافلے کے سبھی لوگ بہت پریشان ہو گئے اور معذرت خواہی کی غرض سے انتہائی ادب کے ساتھ امامؑ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے لئے ان کی طرف بڑھنے لگے۔ سب لوگوں نے امامؑ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر شکایت کرتے ہوئے کہا: "آخر آپ نے ہم لوگوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ ممکن تھا کہ انجانے میں ہم لوگوں سے آپ کی شان میں کوئی جسارت یا گستاخی سرزد ہو جاتی اور ہم لوگ ایک بڑے گناہ کے مرتکب ہو جاتے" امام نے جواب دیا: "چونکہ تم لوگ مجھے نہیں پہچانتے تھے اس لئے میں نے عمداً تم لوگوں کی ہمراہی اختیار کی تھی۔ کیونکہ جب میں جان پہچان والے لوگوں کے ساتھ سفر کرتا ہوں تو وہ لوگ رسول مقبولؐ کی وجہ سے میرے ساتھ بڑی ہی محبت اور مہربانی کا سلوک کرتے ہیں اور مجھے اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی چھوٹا موٹا کام بھی انجام دوں۔ اس وجہ سے میں یہ چاہتا ہوں کہ ایسے ہمسفر کا انتخاب کروں جو مجھے بالکل ہی نہ پہچانتے ہوں تاکہ میں اپنے کام خود انجام دے سکوں۔ میں لوگوں سے اپنا تعارف کروانے سے بھی

پرہیز کرتا ہوں تاکہ دوستوں کے خدمت کی سعادت بھی حاصل ہوجائے۔ [۱]

---

[۱] بحار جلد ۱۱، چاپ کمپنی ص ۲۱ و ص ۲۷ ۔ اس کتاب میں جو جملے امام سے منقول ہیں وہ اس طرح ہیں۔ "اکرہ ان اخذ برسول اللّٰہ ما لا اعطی مثلہ" اور ایک دوسری روایت میں امام سے یوں نقل کیا گیا ہے: "ما اکلت بقرابتی من رسول اللّٰہ قط ۔"

⑧

مسلمان اور ایک اہل کتاب

ان دنوں شہر کوفہ اسلامی حکومت کا اہم مرکز تھا۔ شام کے علاوہ تمام اسلامی سلطنت کے لوگوں کی نگاہیں اس شہر پر لگی رہا کرتی تھیں کہ دیکھو اس شہر سے کون سا نیا فرمان صادر ہونے والا ہے اور کیسے اہم فیصلے لئے جانے والے ہیں۔

شہر سے باہر دو آدمی جنمیں ایک مسلمان اور دوسرا اہل کتاب یعنی یہودی، عیسائی یا زردشتی تھا، ایک دن سڑک کے کنارے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کا مقصد دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ مرد مسلمان کوفہ جا رہا ہے اور وہ اہل کتاب کوفے کے قریب ہی ایک دوسری جگہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دونوں آدمیوں نے یہ طے کیا کہ کافی دور تک ہم لوگوں کا راستہ ایک ہے لہذا ایک ساتھ ہی سفر کریں گے تاکہ باہمی گفتگو کی وجہ سے راستہ آسانی سے طے ہو جائے۔

مختصر یہ کہ خشک راستہ نہایت سکون و آرام اور آپسی گفتگو کی وجہ سے

بڑی آسانی سے کٹ گیا۔ راستے بھر دونوں آدمی مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر کار وہ لوگ ایک ایسے دوراہے پر پہنچ گئے جہاں سے دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جب اس اہل کتاب نے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کا مسلمان دوست کوفہ کی طرف جانے کے بجائے اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اہل کتاب اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور مسلمان دوست سے دریافت کیا:

"کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم کوفہ جاؤ گے؟"

"میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ مجھے کوفہ جانا ہے۔" اس مسلمان نے جواب دیا

"تو پھر تم اس طرف کیوں آرہے ہو۔ یہ کوفے کا راستہ نہیں ہے۔ کوفے کا تو بس ایک ہی راستہ ہے جو تم پیچھے چھوڑ گئے۔"

"میں جانتا ہوں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ تھوڑی دور تک تمہارا ساتھ دیدوں۔ ہمارے پیغمبر نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب دو آدمی آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو ایک ساتھی کا دوسرے ساتھی پر کچھ حق پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں تیرا حق ادا کرنے کے لئے کچھ دور تیرے ساتھ ساتھ چلا آیا ہوں۔ اس کے بعد تو میں اپنے راستے کی طرف لوٹ جاؤں گا۔"

"اوہ! تمہارے پیغمبر نے لوگوں پر اپنا اتنا اثر قائم کر لیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ ان کا اخلاق تھا جس کی وجہ سے اسلام اتنی تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔"

اس وقت اس اہل کتاب کو بڑی حیرت ہوئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کا مسلمان دوست اور ہم سفر کوئی اور نہیں بلکہ خلیفہ وقت حضرت علیؑ ابن ابی طالب تھے ۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ اہل کتاب مسلمان ہوگیا اور حضرت علیؑ کے وفادار اور مومن ساتھیوں میں شمار کیا جانے لگا۔[1]

---

[1] اصول کافی ۔ جلد ۲ باب حسن الصحابۃ وحق الصاحب فی السفر ص ۶۷۰

۹

خلیفہ کی سواری کا احترام

حضرت علی علیہ السلام کوفے کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں وہ شہر انبار میں داخل ہوئے جہاں زیادہ تر لوگ ایرانی تھے۔

ایرانی کسانوں اور شہر انبار میں زندگی بسر کرنے والے تمام دوسرے لوگوں کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا محبوب خلیفہ اس بستی سے ہو کر گزرے گا۔ سبھی لوگ اپنے خلیفہ کے استقبال کے لئے دوڑ پڑے۔ جیسے ہی علیؑ کی سواری آگے بڑھی ان لوگوں نے اس کے آگے آگے دوڑنا شروع کر دیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سواری روک دی اور ان لوگوں کو طلب کیا اور پوچھا۔ "آخر تم سب لوگ اس طرح کیوں دوڑ رہے ہو؟ تمہاری اس دوڑ بھاگ کا مقصد کیا ہے؟"

ان لوگوں نے دست بستہ گزارش کی "دراصل یہ امراء و محترم افراد کے احترام کا ایک روایتی انداز ہے۔ ہم لوگوں کا طریقہ رہا ہے کہ اپنے محبوب رہنما اور سماج کی برگزیدہ شخصیتوں کا اس انداز سے احترام کریں۔ یہ کوئی بدعت نہیں بلکہ اس علاقے کی پرانی رسم ہے۔"

حضرت علیؑ نے ان لوگوں سے کہا: "اے لوگو! تمہارا یہ عمل تمہیں دنیا میں

تو تکلیف پہونچا ہی رہا ہے اور آخرت میں بھی تمہیں اس کے عوض دشواریاں برداشت کرنی پڑیں گی۔ ایسے کام قطعی مت کیا کرو جس سے تمہاری ذلت ورسوائی ہوتی ہو۔ پھر تم خود ہی غور کرو کہ تمہارے اس عمل سے تمہارے اس امیر یا آقا کو کیا فائدہ ہوتا ہے جس کے احترام کی خاطر تم یہ سب کچھ کرتے ہو۔" ؎

؎ نہج البلاغہ، کلمات قصار، شمارہ ۳۷

۱۰

امام باقرؑ اور ایک عیسائی

امام باقرؑ، محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام جن کا لقب باقر ہے۔ باقر کے لغوی معنی ہیں شگاف ڈالنے والا۔ انھیں باقر العلوم کے نام سے پکارا جاتا تھا جس سے مراد ہے علم کا تحلیل و تجزیہ کرنے والا۔

ایک عیسائی نے کلمۂ باقر کا لفظ بقر کرتے ہوئے امام کا مذاق اڑانا چاہا اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "انت بقر" یعنی تو گائے ہے۔

امامؑ نے بغیر کسی ناراضگی یا غصے کا اظہار کرتے نہایت سادگی سے اس شخص کو جواب دیا۔ "نہیں بھائی میں بقر نہیں باقر ہوں"

عیسائی پھر بولا۔ "تو ایک باورچن کا بیٹا ہے تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری ماں اس قسم کے گھٹیا کام کیا کرتی تھی اور لوگوں کا جو ٹھا برتن صاف کرکے اور ان کے گھر میں کھانا پکا کر اس نے تیری پرورش کی ہے۔"

وہ عیسائی آگے یوں ہی گستاخی کرتا چلا گیا۔ "تیری ماں تو سیاہ رنگ، بے شرم اور بد زبان بھی تھی۔"

امام نے پھر نہایت سادگی سے جواب دیا۔ "میری والدہ کے بارے میں تم نے جو باتیں کہی ہیں اگر وہ سچ ہیں تو پروردگار عالم سے میری یہی تمنا ہے کہ وہ میری ماں کے گناہوں کو بخش دے۔ اور اگر یہ باتیں جھوٹ اور بے بنیاد ہیں تو پھر میری دعا یہ ہے کہ پروردگار تیرے گناہ معاف کر دے کیونکہ کسی پر جھوٹا الزام لگانا گناہ ہے۔"

ایک ایسے غیر مسلم کے ساتھ جسے ہر قسم کی تکلیف پہونچانا امام کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ پھر بھی امام نے نہایت خوش اخلاقی کا ثبوت فراہم کیا امام کے اس حلم کا مشاہدہ اس بات کے لئے کافی تھا کہ وہ عیسائی شخص کے اندر روحانی انقلاب پیدا کر دے۔ چنانچہ وہ عیسائی آہستہ آہستہ اسلام کی طرف کھنچنے لگا۔

بعد میں اس عیسائی نے اسلام قبول کر لیا۔ [1]

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۱ حالات امام باقرؑ ص ۸۳

(۱۱)

ایک عرب اور رسول اکرمؐ

ایک عرب بیابانی شہر مدینہ میں داخل ہوا اور سیدھے مسجد نبوی پہونچ گیا تاکہ رسول اکرمؐ سے کچھ سونا چاندی اور مال دنیا میں دوسری چیزوں کا مطالبہ کرے ۔ اس وقت رسول اکرم اپنے اصحاب اور دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے ۔ اس وحشی عرب نے رسول خدا کے سامنے اپنی حاجت پیش کردی اور ان سے عطیہ کا طلبگار ہوا ۔ رسول مقبول نے اسے کچھ چیز عطا کردی لیکن اس سے اس وحشی عرب کو تسکین نہ ہوئی ۔ وہ شخص بڑی امیدیں لیکر آیا تھا جس کے مقابلے میں عطیۂ رسولؐ اسے بہت کم معلوم ہوا ۔ چنانچہ اس نے چند بھونڈے اور گندے الفاظ کے ذریعہ رسول خدا کی شان میں جسارت کردی ۔ یہ دیکھ کر اصحاب اور یاران رسولؐ غصہ سے آگ بگولا ہوگئے اور اس شخص کو کڑی سے کڑی سزا دینے کے لئے اصحاب کا خون کھول اٹھا مگر رسولؐ خدا نے اپنے ساتھیوں کو روک دیا ۔

اس کے بعد رسول مقبولؐ اس وحشی عرب کو ساتھ لئے ہوئے اپنے گھر تشریف لائے اور حتی الامکان اس کی کچھ اور مدد بھی کر دی۔ اس ضمن میں اس عرب بیابانی نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ رسول اکرمؐ کے حالات اور دیگر رؤسا و حکام وقت کے حالات اور طرز زندگی میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ اور اس نے جس زر و جواہر کا رسولؐ سے مطالبہ کیا ہے وہ ان کے پاس واقعی نہیں ہے۔

چنانچہ رسول مقبولؐ کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اسے تسکین ہو گئی کہ انھوں نے جو کچھ عطا کیا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔ لہذا اس نے رسول مقبولؐ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: آپ نے جو کچھ عطا کیا ہے میں اس سے بالکل مطمئن ہوں۔" یہ سن کر رسول مقبولؐ نے اس عرب بیابانی سے کہا: "تو نے کل میرے حق میں ناشائستہ اور گندے الفاظ کا استعمال کر کے میرے اصحاب اور دوستوں کے جذبات کو گہری چوٹ پہونچائی ہے۔ اور وہ لوگ تجھ سے بہت ناراض ہیں اور مجھے اس بات کا ڈر ہے کہیں وہ لوگ تجھے کوئی نقصان نہ پہونچا دیں۔ لہذا کیا یہ ممکن ہے کہ تو اپنے اطمینان اور تشکر کا اظہار ان لوگوں کے سامنے کر دے تاکہ ان لوگوں کا غصہ دور ہو جائے اور وہ تجھے کوئی نقصان نہ پہونچائیں! اس عرب بیابانی نے جواب دیا کہ مجھے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔"

دوسرے دن عرب بیابانی مسجد مدینہ میں داخل ہوا۔ تمام اصحاب اور یاران رسولؐ حسب معمول مسجد میں جمع تھے۔ رسول مقبولؐ نے اپنے

ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "بھائیو! یہ شخص مجھ سے راضی ہوگیا ہے اور اب اس کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہ گئی"۔ اس کے بعد اس عرب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "کیوں بھائی کیا تو مجھ سے پوری طرح مطمئن ہوگیا؟" اس سوال کے جواب میں اس شخص نے ان شکریہ آمیز کلمات کو سب لوگوں کے سامنے دہرا دیا جو اس نے رسول خدا سے تنہائی میں کہے تھے۔ اس کی بات کو سن کر اصحاب اور یاران رسول ہنسنے لگے۔

اس وقت رسول اکرم نے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اس قسم کے افراد اور میری مثال اس شخص جیسی ہے جس کا اونٹ اپنے مالک کی کسی بات سے ناراض ہو کر جنگل کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا مالک بھی اونٹ کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ یہ ماجرا دیکھ کر لوگوں نے اونٹ کے مالک کی امداد کے خیال سے شور و غل مچانا شروع کر دیا اور ایک بڑی بھیڑ اس بگڑے ہوئے اونٹ کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑی۔ بھیڑ کو آتا ہوا دیکھ کر اونٹ نے اپنے بھاگنے کی رفتار تیز کر دی۔ یہ دیکھ کر اونٹ کا مالک گھبرا گیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی زور سے چلایا۔ "بھائیو! آپ لوگوں سے استدعا ہے کہ میرے اونٹ کے پیچھے مت پڑو۔ میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے اونٹ کو کس طرح مناؤں۔

اس کی آواز سن کر بگڑے ہوئے اونٹ کے پیچھے بھاگنے والی بھیڑ ٹھہر گئی۔ اس کے بعد اونٹ کے مالک نے مٹھی بھر چارا اپنے ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ اونٹ کے قریب پہونچ گیا۔ اور نہایت سہولت و آسانی

کے ساتھ اونٹ کی مہار اپنے ہاتھوں میں لے لی اور وہ بگڑا ہوا اونٹ اپنے مالک کے ساتھ واپس آگیا۔

"اگر میں نے کل تم لوگوں کو منع نہ کر دیا ہوتا تو اس بدبخت عرب کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا اور تم لوگ اسے زندہ نہ چھوڑتے اور یہ کفر وبت پرستی کی حالت میں مار ڈالا جاتا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے تم لوگوں کو کسی قسم کے اقدام سے روک دیا تھا۔ اور تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ میں نے اس شخص کو اپنی محبت اور نرمی کے ذریعہ بالکل مطمئن کر لیا۔"[1]

---

[1] کحل البصر ص۔ ۰۰

(۱۲)

مردِ شامی اور امام حسینؑ

اہل شام[1] میں سے ایک شخص حج یا دوسرے کسی مقصد سے مدینہ آیا۔ ایک دن اچانک اس کی نگاہ ایک ایسے آدمی پر پڑی جو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ آدمی آخر کون ہے؟ قریب ہی کھڑے ہوئے ایک دوسرے شخص سے اس نے دریافت کیا: "کیوں بھائی! یہ کون ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "یہ حسین بن علی بن ابیطالب ہیں۔" سابقہ تبلیغات

---

[1] شام حضرت عمر کی خلافت کے دور میں فتح ہوا تھا اور فتح اسلام کے بعد پہلی بار حکومت شام کو یزید بن ابوسفیان کے سپرد کر دیا گیا۔ دو سال حکومت کرنے کے بعد یزید مر گیا۔ چنانچہ اس تمیتی علاقے کی حکومت کی باگ ڈور یزید کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان کے سپرد کر دی گئی۔ اور معاویہ نے بیس سال تک پورے اقتدار کے ساتھ اس علاقے پر حکومت کی۔ حضرت عمر کے دور میں حاکموں کو جلد از جلد معزول کر کے ان کی جگہ پر نئے حکام مقرر کر دیئے جایا کرتے تھے اور کسی کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ ایک علاقے پر کئی برس تک حکومت کرکے وہاں اپنی جگہ مضبوط کرے۔ مگر معاویہ اپنی حکومت پر برقرار رہا اور اسے معزول نہیں کیا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر لیا کہ خلافت کے خواب دیکھنے لگا چنانچہ بیس سال کی حکومت کے بعد ایک خونریز جنگ کے ذریعہ اس کے خواب پورے ہو گئے

اور بے بنیاد پروپیگنڈے نے اس شامی کے دل و دماغ کو پوری طرح متاثر کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ نام سنتے ہی اس کا چہرہ غصے کی شدت کی وجہ سے ایکدم سرخ ہوگیا۔ اور اس نے فرزند آل اللہ کی نیت سے امام حسینؑ پر بے شمار گالیوں کی بوچھار کر دی۔ اور گندے سے گندے الفاظ کے استعمال کے ذریعہ اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ امام حسینؑ اس شخص کی گالیوں سے قطعی ناراض نہیں ہوئے اور نہایت خوش اخلاقی اور کمالِ محبت کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے قرآن مجید کی ان آیات کی تلاوت کرنی شروع کر دی جس میں حسن اخلاق، عفو اور چشم پوشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآنی آیات کی تلاوت کے بعد انہوں نے اس شامی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری ہر خدمت اور تم سے ہر طرح کے تعاون کے لئے آمادہ ہیں۔" اس کے بعد

اور اس نے آئندہ بیس برس تک شام اور دیگر اسلامی مملکت پر خلیفہ مسلمین کی حیثیت سے حکومت کی۔ اس طرح سرزمین شام پر جنم لینے والوں نے اموی حکومت کے سایہ میں پرورش پائی اور انہیں کی تعلیم و تربیت میں شامی لوگ پروان چڑھے۔ اور ہم سبھی لوگ بخوبی واقف ہیں کہ بنی امیہ کو ہاشمی قبیلے سے دلی عداوت تھی اور ظہور اسلام کے بعد اس عداوت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ علی اور اولاد علی اموی عداوت کا مرکز بن گئے اور شام کے لوگوں نے قبول اسلام کے ساتھ ہی حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ سے بغض و عداوت کا سبق بھی پڑھا اور دشمنی کا یہ بیج ان کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گیا اپنی تبلیغات کے ذریعہ علیؑ اور اولاد علیؑ سے عداوت کو بنی امیہ نے جزو دین قرار دے دیا تھا۔ یعنی وہ آدمی "سچا مسلمان" ہو ہی نہیں سکتا تھا جو علیؑ اور اولاد علی سے عداوت نہ رکھے۔ چنانچہ شامیوں کا یہ اخلاق اور حضرت علیؑ کی اولادؑ سے عداوت ان کی عادت بن چکا تھا۔

اس شخص سے دریافت کیا۔ "کیا تو اہل شام میں سے ہے؟" اس نے جواب دیا "ہاں میں شام کا رہنے والا ہوں۔" پس امام حسینؑ نے کہا۔ "اہل شام سے لیے اخلاق کا تجربہ مجھے ہے اور میں بخوبی واقف ہوں کہ اس بداخلاقی اور عداوت کا سبب کیا ہے۔"

پھر اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے امامؑ نے کہا۔ "تو اس شہر میں مسافر ہو۔ اس عالم غربت میں اگر تجھے کوئی ضرورت ہو تو بیان کر۔ میں تیری ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ میں تجھے اپنا مہمان بنانا چاہتا ہوں اور تجھے خلعت و نقد وغیرہ بھی دینا چاہتا ہوں۔"

اپنی بے شمار گالیوں کے عوض میں وہ مرد شامی ایک انتہائی شدید عکس العمل کا منتظر تھا۔ اسے یہ امید نہ تھی کہ اس کی گستاخی اور جسارت کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا جائے گا۔ امام کے اخلاق نے اس شخص کے اندر ایک زبردست روحانی انقلاب برپا کر دیا۔ اور وہ بے ساختہ کہنے لگا۔ "میری دلی خواہش تھی زمین پھٹ جائے اور میں اسمیں سما جاؤں۔ اے کاش اپنی نادانستگی کی وجہ سے میں نے یہ گستاخی نہ کی ہوتی۔ اس وقت تک میری نظر میں حسینؑ اور ان کے باپ سے بڑا میرا کوئی بھی دشمن نہ تھا۔ اور اس واقعہ کے بعد سے میری نظروں میں حسینؑ اور ان کے والد بزرگوار علیؑ سے زیادہ عزیز کوئی دوسرا نہیں ہے۔" [۱]

---

[۱] نفثۃ المصدور۔ محدث قمی ص ۴۴

(۱۴)

ایک شخص جس نے نصیحت چاہی

ایک مرد بیابانی مدینہ آیا اور رسول اکرم کی خدمت میں درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کچھ پند و نصیحت کیجئے۔ آپ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "غصہ مت کیا کرو" اس جملے کے علاوہ رسول خدا نے اس شخص سے کچھ اور نہ کہا۔

اس کے بعد وہ شخص اپنے قبیلے کی طرف واپس چلا گیا۔ گھر پہونچتے ہی اسے اطلاع ملی کہ اس کی عدم موجودگی میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ اس کی قوم کے نوجوانوں نے دوسرے قبیلے کا کچھ مال جبراً لوٹ لیا تھا جس کے جواب میں دوسرے قبیلے کے لوگوں نے بھی اس کے قبیلے کا بہت سارا مال لوٹ لیا۔ اور باہمی لوٹ مار کا یہ سلسلہ اب اس وقت ایسی نازک منزل پر پہونچ گیا ہے کہ دونوں قبیلوں کے درمیان گھمسان لڑائی اور قتل و غارت گری کی پوری تیاری ہو رہی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی وہ شخص شدت غیظ و غضب کی وجہ سے بھڑک اٹھا۔ بے حد لاہو گیا۔ اس نے فوراً ہی اسلحہ زیب تن کیا اور میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنے

قبیلے والوں کا ساتھ دے سکے۔

اسی اثنا میں اسے خیال آیا کہ وہ ابھی مدینہ گیا تھا اور رسول خدا سے نصیحت کا مطالبہ کیا تھا تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اپنے غصے پر قابو رکھا کرو۔

وہ پھر غور کرنے لگا کہ آخر وہ کونسی چیز ہے جس نے اسے اسلحہ اٹھانے پر مجبور کر دیا؟ اور آخر کیا بات ہے جس کی وجہ سے میں لڑنے مرنے اور قتل و خون کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں؟ آخر میں اس قدر غضبناک کیوں ہو گیا ہوں؟ ان تمام سوالوں کے بعد اس نے اپنے طور پر یہ احساس کیا کہ یہی وہ مناسب موقع ہے جب ہمیں رسول مقبول کے اس مختصر جملے کی پیروی کرنی چاہئے۔

اور اپنے قبیلے والوں کی صف سے باہر نکلا اور دوسرے قبیلے کے سردار کو آواز دی اور اس کے قریب آتے ہی اس نے پوچھا۔ "آخر کیا بات ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں؟ اگر اس لڑائی کا مقصد اس مال کی تلافی ہے جو ہمارے قبیلے کے نوجوانوں نے بیوقوفی کی بنیاد پر تمہارے قبیلے کے لوگوں سے زبردستی چھین لیا ہے تو آؤ میں تمہارے اس مال کی تلافی اپنی ذاتی ملکیت سے کئے دیتا ہوں۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں

جب دوسرے قبیلے کے لوگوں نے اس شخص کی عاقلانہ گفتگو سنی تو ان کی غیرت اور مردانگی جاگ اٹھی اور کہنے لگے۔ "ہم لوگ تجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں اگر ایسی بات ہے تو ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں قبیلے کے لوگ خوشی خوشی اپنے گھر واپس لوٹ گئے۔"[1]

---

[1] اصول کافی جلد دوم ص۔ ۴۴۴

(۱۴)

ایک عیسائی اور علیؑ کی زرہ

حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں ان کی زرہ کوفے میں گم ہو گئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ زرہ ایک عیسائی کے پاس دکھائی پڑی۔ علیؑ اس عیسائی کو لیکر دربار قاضی پہونچے اور اس کے خلاف اپنا دعویٰ دائر کر دیا کہ یہ زرہ میری ملکیت ہے۔ اسے نہ میں نے کسی کے ہاتھ فروخت کیا ہے اور نہ ہی کسی کو بطور تحفہ پیش کیا ہے۔ اور ایک عرصے کے بعد میری یہ زرہ اس شخص کے پاس برآمد ہوئی ہے۔ قاضی نے عیسائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "زرہ کے سلسلے میں خلیفہ نے اپنا دعویٰ دائر کر دیا۔ اب اپنی صفائی میں تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" اس نے کہا "یہ زرہ میری اپنی ذاتی ملکیت ہے۔ اور اسی کے ساتھ میں خلیفہ کو جھوٹا بھی نہیں کہتا (ہو سکتا ہے انھیں اس کی شناخت میں غلطی ہو گئی ہو)

قاضی نے علیؑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مدعی ہیں اور یہ شخص منکر ہے لہٰذا آپکی ذمہ داری ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی گواہ پیش کریں"

علیؑ مسکراتے ہوئے بولے۔ "قاضی ٹھیک ہی کہتا ہے مجھے گواہ پیش کرنا چاہیے۔ لیکن اب اس اتفاق کو کیا کہا جائے کہ میرے پاس کوئی گواہ نہیں ہے"۔

گواہ کی ناموجودگی میں قاضی نے اس عیسائی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ قاضی کا حکم سنتے ہی اس عیسائی نے زرہ اٹھائی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

لیکن اس عیسائی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ زرہ کس کی ہے۔ چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد اس پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ پھر لوٹ آیا اور کہنے لگا۔ "یہ طرزِ حکومت اور لوگوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کا انداز عام انسانی سلوک جیسا نہیں معلوم ہوتا اور یہ طرزِ حکومت انبیاء کے طرزِ حکومت جیسا ہے۔" اس کے فوراً بعد اس شخص نے یہ اقرار کر لیا کہ دراصل یہ زرہ علیؑ کی ہے۔

تھوڑے دن بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ عیسائی مسلمان ہوگیا اور انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ جنگ نہروان میں اس نے پرچم علیؑ کے سایہ میں جنگ بھی کی۔[۱]

---

[۱] الامام علی صوت العدالۃ الانسانیہ ص ۶۳ اور بحار الانوار جلد نہم چاپ تبریز ص ۵۹۸ (باختلاف)

(۱۵)

امام صادقؑ اور صوفیا کا ایک گروہ

سفیان ثوری[1] مدینے کا رہنے والا تھا۔ ایک دن وہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ امام ایک عمدہ قسم کا سفید لباس پہنے ہوئے ہیں جو انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے امام صادقؑ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: "یہ لباس آپ کے لائق نہیں ہے، آپ جیسے لوگوں کے لئے یہ بات قطعی مناسب نہیں ہے کہ آپ دنیاوی آرائش سے اپنے کو آلودہ کریں۔ آپ جیسے لوگوں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ زہد و تقویٰ اختیار

---

[1] دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے خود کو زاہد اور صوفی کا نام دیدیا۔ یہ طبقہ ایک مخصوص طرز زندگی کا پیرو تھا اور اس گروہ کی ہر ممکن کوشش یہ تھی دوسرے مسلمانوں کو بھی اپنی روش کا پیرو بنالے۔ اس گروہ کے لوگ یوں ظاہر کرتے تھے کہ مذہب اسلام نے جس راہ کی ہدایت کی ہے وہ دراصل وہی طرز حیات ہے جس پر وہ لوگ گامزن ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ دنیاوی نعمتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہئے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ایک مرد مومن کو عمدہ لباس، من پسند غذا اور اچھے قسم کے مکان سے علیحدگی اختیار کئے رہنا چاہیے۔ اور اگر یہ لوگ کسی مسلمان کو پروردگار کی ان نعمتوں سے فائدہ حاصل کرتا ہوا دیکھ لیتے تھے تو اس کی

کرتے ہوئے اپنے آپ کو دنیاوی آلودگیوں سے دور رکھیں گے۔ یعنی آپ جیسے متقی و پرہیزگار کو اچھے لباس اور عمدہ غذا جیسے دنیاوی جھمیلے سے قطعی دور رہنا چاہیے۔"

سفیان ثوری کی گفتگو کے بعد امام نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "میں تجھ سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جو تیرے لئے دنیا و آخرت میں بڑی مفید ثابت ہوگی اور اگر تیرا مقصد اس سلسلے میں اسلامی احکام سے معلومات فراہم کرنا ہے تو بھی میری بات تیرے لئے انتہائی مفید اور معلوماتی ہوگی۔ لیکن اگر تیرا مقصد مذہب اسلام میں انحراف پیدا کرنا ہے اور ایک بدعت کے ذریعہ سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہی کا شکار بنانا ہے تو کوئی بات نہیں کیونکہ بے راہ روی اور انحراف ایجاد کرنے والوں کے لئے میری بات بے سود ہوا کرتی ہے لہذا اس سے تجھے کوئی فائدہ نہ ہو سکے گا۔ ممکن ہے کہ تیرے ذہن میں رسول مقبولؐ، ان کے اصحاب اور دوستوں کی سادہ اور

تحقیر اور ملامت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک عمدہ لباس، من چاہی غذا اور اچھے مکان سے رغبت رکھنے والے لوگ اہل دنیا ہیں اور ان کا پروردگار سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ امام صادقؑ پر سفیان ثوری کا اعتراض اسی طرز فکر کی بنیاد پر تھا۔

اس روش اور مسلک نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کر لی۔ صرف ہندوستان اور یونان ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں اس مسلک کے ماننے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی۔ مسلمانوں میں اس طرز فکر کے لوگوں کی کمی نہ تھی اور ان لوگوں نے اپنی روش کو اچھا خاصہ مذہبی رنگ دیدیا چنانچہ اس کا سلسلہ نسل درنسل آگے بڑھنے لگا۔

فقیرانہ زندگی کا خیال پیدا ہو رہا ہو۔ اور تونے یہ سمجھ لیا ہو کہ فقیرانہ زندگی بسر کرنا قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ایک امر واجب قرار دیا جا چکا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ رسول مقبولؐ اور ان کے وفادار ساتھی ایسے فقیرانہ اور پریشان کن حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب چاروں طرف فقر و فاقہ اور سختی و تنگدستی کا دور دورہ تھا۔ اور لوگ ان بنیادی چیزوں سے محروم تھے جو عام آدمی کو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ رسول مقبولؐ اور ان کے باوفا اصحاب کی زندگی اس دور کے عام حالات سے مربوط تھی۔ لیکن ایک ایسے دور میں جب ہر طرح کے وسائل زندگی فراہم ہوں اور الٰہی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنے کے مواقع موجود ہوں تو پروردگار کی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے سب سے زیادہ مستحق خالق کائنات کے خاص بندے ہوا کرتے ہیں۔ ان نعمتوں پر فاسقوں اور بدکار لوگوں سے کہیں زیادہ حق اللہ کے نیک اور صالح بندوں کا ہے۔ ان الٰہی نعمتوں کا حق کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو کہیں زیادہ ہے۔

اور اس طرز فکر نے عجیب و غریب اثرات قائم کر دیئے۔ چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے درمیان ایک مخصوص مکتب فکر کی ایجاد ہو گئی جس کا براہ راست اثر اصول زندگی کی بے احترامی اور دنیاوی معاملات میں کسی طرح کی پابندی نہ ہونے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور بعد میں یہی انحراف اور بے راہ روی اسلامی ممالک کے زوال کا باعث قرار پایا۔

اس طرز فکر کے اثرات صرف طبقۂ صوفیا ہی تک محدود نہ رہے بلکہ یہ مخصوص طرز فکر جس کی بنیاد زہد تقویٰ اور ترک دنیا پر رکھی گئی تھی، ان لوگوں پر بھی اثر انداز ثابت ہوئی جو اپنے کو صوفیا کا سب سے بڑا مخالف کہا کرتے تھے اور اس کے بالکل

تو نے آخر کس چیز کو میرے لئے عیب شمار کیا؟ خدا کی قسم جس طرح تو یہ دیکھ رہا ہے کہ میں پروردگار کی نعمتوں سے فائدہ حاصل کر رہا ہوں، سن بلوغ کو پہونچنے کے بعد سے میری زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے اپنے مال سے دوسروں کے حقوق ان کی خدمت میں نہ پہونچا دیئے ہوں۔ ہر صبح و شام میں اس فکر میں لگا رہتا ہوں کہ میرے مال میں جس کا بھی حق ہے اسے پابندی وقت کے ساتھ اس تک پہونچا دوں۔"

سفیان امام کے منطقی دلائل کا جواب نہ دے سکا اور سر جھکا کر اس جگہ سے چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دوستوں اور ہم مسلک ساتھیوں سے

برعکس بہت سے ایسے لوگ جنھیں صوفی کے نام سے پکارا جاتا تھا، اس طرز فکر کے حامل نہ تھے۔ اگر اس طرز فکر کو ایک سماجی بیماری کے نام سے یاد کیا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ یعنی یہ ایک ایسی خطرناک اور مہلک بیماری تھی جس نے اسلامی معاشرہ کو روحانی طور پر بالکل مفلوج کر دیا ہے۔ لہٰذا ضرورت یہ ہے کہ اس خطرناک بیماری کا عمدہ علاج تلاش کیا جائے تاکہ سماج کو اس کے بھیانک اثرات کا شکار نہ بنایا جا سکے۔ افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اس بیماری کے خلاف کوئی موثر جد و جہد نہیں کی جا سکی اور اس طرز فکر کو دور کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا سکا۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تمام تحریک ذاتی جھگڑوں اور طبقاتی کشمکش کا شکار ہو گئی اور دنیاوی مناصب کی لالچ میں بہت سے لوگ جد و جہد کی راہ سے کنارہ کش ہو گئے اور اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ تصوف کے خلاف جد و جہد کرنے والے لوگ اس بیماری کا خود شکار ہوا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس جد و جہد میں شریک لوگ بلند افکار اور اعلی انسانی اقدار سے قطعی ناواقف ہوا کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انسانی شرافت اور شاہکار انسانیت کیا ہیں اور اگر کچھ لوگوں کو بلند انسانی افکار کا علم ہو جاتا ہے

ملاقات کی اور سارا ماجرا ان لوگوں سے کہہ سنایا۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب لوگ ایک ساتھ مل کر امام صادقؑ سے اس موضوع پر بحث و مباحثہ کریں

آخر کار سفیان ثوری اور اس کے تمام ساتھی ایک گروہ کی شکل میں امام صادقؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے ۔ "میرا دوست اپنی بات کو حق ثابت کرنے کے لئے مناسب دلائل نہیں پیش کر سکا۔ چنانچہ اب ہم لوگ روشن دلائل کے ذریعہ آپ کو لاجواب کرنے آئے ہیں۔"

امام نے پوچھا ۔ "کہو تمہاری دلیل کیا ہیں جن کی روشنی میں تم لوگ مجھے لاجواب کرنا چاہتے ہو"۔

اور وہ سماج میں پھیلی ہوئی بیماری کو دور کرنے کے لئے حق کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو ان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا جاتا ہے۔ تصوف کے خلاف جد و جہد کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اس طرزِ فکر کی مخالفت کی جائے جو اسلامی معاشرہ کے حق میں ایک مہلک بیماری کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کی وجہ سے امت اسلامیہ مختلف قسم کی بدعتوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ صوفیا کی طرزِ فکر کی مخالفت کرتے وقت امام صادقؑ کی اس حدیث کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ بہرحال یہ جد و جہد یا مخالفت ذاتی اور طبقاتی شکل نہ اختیار کرنے پائے اور نہ ہی اسے زمان و مکان یا جغرافیائی حدود کے دائرے میں محدود کیا جائے بلکہ طریقہ کار یوں ہونا چاہیے کہ جہاں کہیں اور چاہے جس گروہ کے ذریعہ اس قسم کے خیالات پیش کئے جائیں وہاں ہمیں اس خیال اور نظریہ کو باطل ثابت کرنے کے لئے اقدام کرنا چاہیے

بہرصورت اس طرزِ فکر کی تردید کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کا یہ بیان بہت جامع ہے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ امام کی یہ حدیث مستند کتابوں میں محفوظ رہ گئی جس کی اشاعت کے ذریعہ اسلامی اصول میں انحراف کی ہر کوشش سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ہماری دلیل قرآنی آیات پر مشتمل ہیں۔"

امام نے فوراً ہی جواب دیا "قرآن مجید سے بہتر اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے۔ پس تم لوگ اسے بیان کرو۔ میں تمہاری دلیلوں کو سننے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔" ان لوگوں نے کہا "ہم اپنے دعویٰ کی دلیل اور اپنے مسلک کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے قرآن مجید کی دو آئیں پیش کرتے ہیں۔ اور ہماری بات کی وضاحت کے لئے بس یہ دو آیات قرآنی کافی ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مالک کائنات نے رسولؐ کے بعض اصحاب کی ستائش اس انداز میں کی ہے۔

"اس کے باوجود کہ ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتی تھیں اور وہ تنگ دستی اور غربت میں تھے دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرتے تھے اور ان کی ضرورت کو دور کرتے تھے جو لوگ بخل اور کنجوسی کے وصف سے محفوظ ہیں وہ فلاح پانے والے ہیں"۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

"باوجودیکہ وہ غذا کی خواہش اور احتیاج رکھتے تھے اس حالت میں بھی وہ غذا کو فقیر یتیم اور اسیر کو دیتے تھے۔"

۴

جیسے ہی ان لوگوں کی بات ختم ہوئی، اہل مجلس میں سے ایک شخص جو ان لوگوں کی بات بڑے غور سے سن رہا تھا، بے ساختہ بول پڑا: "تمہاری اب تک کی باتوں سے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنی بات پر بھی پورا عقیدہ اور بھروسہ نہیں ہے۔ دراصل ان دلائل کے ذریعہ تمہاری خواہش یہ ہے کہ لوگ اپنے مال و دولت اور اپنی ملکیت میں کوئی دلچسپی نہ لیں اور اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ تم جیسے مسکین اور فقیر صورت لوگوں کو دیدیا کریں اور تم لوگ ان کے مال سے فائدہ اٹھا سکو۔ اس کے علاوہ عملی طور پر آج تک ایسا نہیں دیکھا گیا کہ تم لوگوں نے عمدہ غذا کے استعمال سے پرہیز کیا ہو۔ تمہاری اس تبلیغ کا مقصد واضح ہے کہ تم دوسرے مسلمانوں کو عمدہ غذا سے دور رکھنا چاہتے ہو۔"

امامؑ نے اہل مجلس سے ارشاد فرمایا: "تم لوگ جلد بازی میں اس قسم کی باتیں مت کرو کیونکہ ایسی باتیں بے سود ہوا کرتی ہیں۔" اس کے بعد امامؑ نے گروہ صوفیا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "تم لوگ قرآن مجید سے استدلال تو کرتے ہو مگر پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم لوگ قرآن مجید میں محکم و متشابہ اور ناسخ و منسوخ کے درمیان فرق کر سکتے ہو یا نہیں؟ امت اسلامیہ میں زیادہ تر لوگ صرف اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ صحیح اطلاعات حاصل کئے بغیر وہ اللہ کی اس مقدس کتاب سے متمسک ہو گئے۔"

صوفیا نے جواب دیا: "اس سلسلے میں ہمیں کچھ معلومات ضرور ہیں مگر پوری طرح سے ان چیزوں کا علم ہم لوگوں کو نہیں ہے۔"

امامؑ نے کہا: " دیگر افراد کی طرح تم لوگوں کی بدقسمتی بھی یہی ہے۔ آیات قرآنی کی طرح احادیث پیغمبر بھی ہیں۔ حدیث اور قرآن سے استدلال کرتے وقت ان دونوں چیزوں سے متعلق جملہ علوم پر پوری دسترس رکھنا بہت ضروری ہے۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو گمراہی کے امکانات زیادہ ہیں۔"
اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوتے امام صادقؑ نے صوفیاء کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: " لیکن تم لوگوں نے جن قرآنی آیات کو اپنے مسلک کی حقانیت اور اپنے موجودہ دعوی کے ثبوت میں پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اللہ کی نعمتوں کے استعمال کو حرام نہیں قرار دیا گیا بلکہ ان آیات کا تعلق انکساری، بخشش اور قربانی سے ہے۔ ان آیتوں میں قرآن مجید ان لوگوں کی مدح کرتا ہے جنھوں نے ایک مخصوص وقت میں دوسروں کو اپنی ذات پر مقدم شمار کیا اور انھیں ترجیح دیتے ہوئے اپنے حلال مال کو خود استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کی خدمت میں پیش کردیا۔ اگر انھوں نے اپنا مال نہ دیا ہوتا تو بھی وہ گنہگار نہ قرار دئے جاتے کیونکہ پروردگار نے ان لوگوں کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ ایسا ضرور کریں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مالک کائنات نے ایسا کرنے سے روکا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے احسان اور مہربانی کے حکم کی روشنی میں اپنی ذات پر تکلیفیں برداشت کریں اور اپنا مال دوسروں کے حوالے کردیا۔ جس کا بدلہ پروردگار انھیں یقیناً عطا کرے گا۔ پس ان آیات اور تمہارے دعوی کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے۔ کیونکہ تم ان لوگوں کی مذمت کرتے ہو جو اپنے مال اور اللہ کی عطا کردہ

نعمتوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور قرآن مجید تمہیں ایسا کرنے کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔"

امام صادقؑ نے ان صوفیا کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا: "اس دن ان لوگوں نے (اصحاب رسولؐ نے) اس قسم کی سخاوت اور بخشش کا مظاہرہ ضرور کیا لیکن بعد میں خداوند عالم کی طرف سے اس سلسلے میں کامل اور جامع حکم آ پہونچا جسمیں خداوند عالم نے اس کام کی حدود معین کر دیں۔ اور چونکہ اللہ کا یہ حکم بعد میں آیا اس لیے یہ حکم ان لوگوں کے عمل کو منسوخ کر دیتا ہے، چنانچہ ہمیں اس حکم کی پیروی کرنی چاہیئے کہ اصحاب رسول کے اس عمل کی"

خداوند عالم نے مومنین کے حالات کی اصلاح کے لیے اپنی رحمت خاص کے ذریعہ اس بات سے منع کیا ہے کہ کوئی شخص اپنے اہل وعیال کو تکلیف میں رکھ کر اپنی پونجی دوسروں کے حوالے کر دے۔ کیونکہ اس شخص کے گھر والوں میں بوڑھے، بچے اور ایسے کمزور لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو اس تکلیف کا تحمل نہیں کر سکتے۔ فرض کرو میرے پاس ایک روٹی ہے اور میں اسے دوسروں کے اوپر خرچ کر دیتا ہوں۔ تو اس کا انجام یہ ہو گا کہ میرے اہل وعیال جن کی ذمہ داری میرے اوپر ہے وہ تباہی، بربادی اور ہلاکت کا شکار ہو جائیں گے۔ لہٰذا رسولؐ مقبول نے ارشاد فرمایا اگر کسی شخص کے پاس کچھ خرمے یا کچھ روٹیاں یا چند دینار ہیں اور وہ انھیں خرچ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے وہ اسے اپنے والدین پر خرچ کرے، اس کے بعد وہ اسمیں سے اپنی بیوی بچے اور خود اپنی ذات

کو ترجیح دے اور تیسری منزل میں وہ اسے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور بھائیوں پر خرچ کرے اور چوتھی منزل پر خیرات وغیرہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اس طرح خیرات کی منزل سب کے بعد آتی ہے۔ رسولؐ خدا نے جس وقت یہ سنا کہ انصار میں ایک شخص مرگیا، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے موجود ہیں اور مرنے سے پہلے اس شخص نے اپنی ساری ملکیت راہ خدا میں خرچ کردی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے اس بات کی اطلاع مجھے پہلے دیدی ہوتی تو میں اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیتا۔ وہ اپنے بچوں کو بے سہارا چھوڑکر چلاگیا کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے رہیں!!"

"میرے والد امام باقرؑ نے مجھ سے نقل کیا کہ رسولؐ خدا نے ارشاد فرمایا ہے: "ہمیشہ اپنے خرچ کا سلسلہ اپنے بچوں سے شروع کرو اور قربت کے اعتبار سے جو جتنا نزدیک ہو اسے اتنی ہی ترجیح دو۔"

ان تمام باتوں کے علاوہ قرآن مجید تمہاری روش اور تمہارے مسلک کی نہی کرتا ہے۔ ایک جگہ قرآن مجید یوں ارشاد کرتا ہے:

"متقی اور پرہیزگار وہ لوگ ہیں جو بخشش اور انفاق کے مقام پر اسراف اور زیادہ روی اور نہ کنجوسی اور بخیلی سے کام لیتے ہیں بلکہ وہ لوگ اعتدال اور میانہ روی کو اختیار کرتے ہیں۔"

قرآن مجید کی اکثر و بیشتر آیات میں جس طرح بخیلی اور کنجوسی کی ممانعت کی گئی ہے بالکل اسی طرح بذل و بخشش میں فضول خرچی اور تندروی کی بھی نہی کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے اس کام کے لئے میانہ روی کا درس دیا ہے۔ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اپنی تمام ملکیت دوسرے لوگوں میں تقسیم کردے اور خود مفلسی اور تہی دستی کے عالم میں پروردگار کی بارگاہ عالیہ میں دست دعا بلند کردے کہ اے پروردگار! مجھے روزی دے۔ واضح رہے کہ خداوند عالم اس قسم کی دعاؤں کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ پیغمبر اسلام نے ایک جگہ پر ارشاد فرمایا ہے کہ خداوند کچھ لوگوں کی دعاؤں کو ہرگز قبول نہیں کرتا اور وہ یہ لوگ ہیں۔

الف : جو شخص پروردگار سے اپنے ماں باپ کی برائی کا خواہاں ہوتا ہے

ب : جو شخص اپنا مال کسی دوسرے کو قرض دے اور نہ اس کا کوئی گواہ بنائے اور نہ ہی اس کی کوئی سند حاصل کی ہو۔ اور قرض لینے والا بعد میں اس کا مال ہضم کرے۔ ایسی صورت میں اگر قرض دینے والا شخص اپنے مال کی واپسی کے لئے پروردگار سے دعا کرتا ہے تو پروردگار اس کی دعا ہرگز قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس نے بغیر کسی سند یا گواہ کے اپنا مال دوسرے کو قرض دے کر اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی ماری ہے۔

ج : جو شخص پروردگار سے یہ دعا کرتا ہے کہ اسے اس کی بیوی کے شر سے نجات عطا کردے تو پروردگار ایسے شخص کی دعا بالکل نہیں سنتا اس لئے کہ بیوی کے شر سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ اور ذریعہ خود اس

شخص کے ہاتھوں میں ہوا کرتا ہے۔ اگر وہ واقعی اپنی بیوی سے پریشان اور عاجز ہو چکا ہے تو اسے اختیار ہے کہ ایسی بیوی کو طلاق دے کر اپنی پریشانی دور کرے۔

د :- جو شخص اپنے گھر کے اندر ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا رہے اور پروردگار سے روزی کا طلبگار ہو تو پروردگار ایسے لالچی اور جاہل بندے کی دعا کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے۔

" اے میرے بندے! کیا میں نے تیرے لئے حرکت و جنبش کی راہیں نہیں کھول رکھیں! کیا میں نے تجھے صحیح اور مضبوط اعضاء و جوارح نہیں عطا کئے؟ میں نے تجھکو ہاتھ، پیر، آنکھ، کان اور عقل سلیم عطا کی ہے تاکہ تو دیکھ سن کر اس پر غور و فکر کے بعد تلاش معاش میں ہاتھ پیر کو حرکت دے۔ ان تمام اعضاء کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ ان نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ تو ان سے کام لے۔ اس طرح میں نے اپنے اور تیرے درمیان حجت تمام کر دی تاکہ تو ہر چیز کو حاصل کرنے کے لیے محنت سے کام لیتے ہوئے قدم آگے بڑھا سکے۔ اور محنت و کوشش پر مبنی میرے حکم کی اطاعت بجالائے اور دوسروں کے کندھے کا بوجھ نہ بنے۔ اگر تیری کوشش میری مشیت کے مطابق رہی تو میں تجھے کافی مقدار میں روزی عطا کر دوں گا اور اگر کسی سبب یا مصلحت کی بنا پر تو ترقی نہ کر سکا تو بھی تجھے اس بات سے اطمینان ضرور حاصل ہوگا کہ تجھ سے کوشش کرنے کے لئے کہا گیا تھا سو تو نے کوشش اور محنت کی۔ اس کے آگے تو معذور ہوگا۔

ھ :۔ وہ شخص جس کو پروردگار نے مال و دولت کی فراوانی عطا کی تھی اور اس نے بخشش کی زیادتی کی وجہ سے اپنا تمام سرمایہ لٹا دیا ہو اور بعد میں پروردگار سے یہ دعا کرے کہ میرے پالنے والے مجھے روزی دے تو پروردگار ایسے شخص کے جواب میں یوں ارشاد کرتا ہے۔

"کیا میں نے تجھے کثیر روزی نہیں عطا کی تھی؟ آخر تو نے میانہ روی سے کیوں کام نہیں لیا؟"

"کیا میں نے یہ حکم نہیں دیا کہ بخشش کے سلسلے میں میانہ روی سے کام لیا کرو!"

"کیا میں نے بے حساب بذل و بخشش اور خیرات سے تم لوگوں کو نہیں روکا ہے؟"

و :۔ وہ شخص جو پروردگار عالم سے قطع رحم کے سلسلے میں دعا کرتا ہے اور اپنے اللہ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جس پر قطع رحم لازم ہو۔

"خداوند عالم نے قرآن مجید میں خصوصاً اپنے پیغمبر کو بخشش کا طریقہ سکھایا ہے۔ ایک داستان یوں بیان کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام کے پاس کچھ سونے کے سکے تھے اور وہ انھیں فقیروں کے اوپر خرچ کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک رات کے لیے بھی وہ رقم ان کے گھر میں پڑی رہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے دن بھر میں سونے کے وہ تمام سکے لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔ دوسرے دن صبح کے وقت ایک سائل پیغمبر کے دروازے پر آیا اور ان سے مدد کا طالب ہوا۔

اپنی ضرورت کی وجہ سے اس فقیر نے اپنے مطالبے پر اصرار بھی کیا۔ لیکن پیغمبر کے پاس اس فقیر کو دینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ انھیں اس بات سے گہرا صدمہ پہونچا۔ اسی وقت قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی جس میں پروردگار نے بخشش کے سلسلے میں ضروری احکام صادر کئے ہیں۔

"اپنے ہاتھ کو اتنا بند بھی نہ رکھو اور نہ اپنے ہاتھ بالکل کھلے رکھو جس سے بعد میں تہی دست ہو جاؤگے اور سائل کے طلب پر شرمندگی اور خجالت اٹھانی پڑے۔"[1]

یہ وہ احادیث ہیں جو پیغمبر اسلام سے مروی ہیں اور قرآنی آیات ان احادیث میں بیان کئے گئے مضامین کی تائید کرتی ہیں۔ پس وہ لوگ جو اہل قرآن ہیں اور جن کا قرآن مجید پر ایمان ہے وہ قرآنی آیات میں درج مضامین پر بھی پورا ایمان رکھتے ہیں۔

ہنگام مرگ حضرت ابو بکر سے کہا گیا اپنے مال کے سلسلے میں وصیت کرو۔ کہا "میری دولت کا پانچواں حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرو اور باقی وارثوں کے لئے ہے اور پانچواں حصہ کم نہیں ہے۔ غرض کہ حضرت ابو بکر نے اپنے مال کے پانچویں حصے کے بارے میں وصیت کردی۔ حالانکہ مریض کو حق ہے کہ مرض الموت میں بھی اپنے مال کے ⅓ حصے کے متعلق وصیت کرے۔ اور اگر وہ جانتا تھا کہ بہتر یہ ہے کہ اپنے تمام حق سے استفادہ کرے تو ⅓ حصے کی وصیت کرتا۔

---

[1] ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسوراً
(سورہ اسراء، آیہ ۲۹)

حضرت سلمان اور حضرت ابوذر کو ان کے زہد و تقویٰ اور دیگر فضائل کی وجہ سے آپ لوگ بخوبی پہچانتے ہو۔ ان کا طرز زندگی اور انکی سیرت بھی یہی تھی جو میں نے بیان کی۔

حضرت سلمان جب بیت المال سے اپنا سالانہ حصہ لیا کرتے تھے تو اس میں سے ایک سال کے اخراجات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ضروری رقم اپنے پاس محفوظ کر لیا کرتے تھے تاکہ آئندہ سال کی تنخواہ ملنے تک انھیں کوئی دشواری نہ ہو۔ لوگوں نے سلمان سے کہا: "آپ اتنے بڑے متقی اور پرہیزگار ہوتے ہوئے بھی ایک سال کے لئے ذخیرہ کی فکر میں پڑے ہوئے ہو۔ فرض کرو آج کل کے درمیان تمہارا انتقال ہو گیا اور سال کے آخر تک زندہ نہ رہ سکے تو اس ذخیرہ کا کیا فائدہ؟ ان لوگوں کی بات کا جواب دیتے ہوئے سلمان نے کہا۔ "شاید میں نہ مروں۔ آخر تم لوگ یہ کیوں فرض کرتے ہو کہ میں مر ہی جاؤں۔ اس کے عوض تم لوگ یہ بھی فرض کر سکتے ہو کہ میں آئندہ سال تک زندہ رہوں۔ اور اگر میں زندہ رہ گیا تو ضروریات زندگی کے لئے بہرحال اخراجات کی ضرورت ہو گی۔ اے نادان لوگو! تم اس حقیقت سے قطعی غافل ہو کہ اگر انسان کے پاس جملہ وسائل زندگی کی فراوانی نہیں ہوتی تو اس کا نفس پروردگار کی اطاعت میں کوتاہی کرتا ہے اور اطاعت حق کے لئے جس سکون اور اطمینان قلب کی ضرورت ہوتی ہے اس کے پاس ایسے سکون کی کمی ہو جاتی ہے اور اگر وسائل زندگی فراوانی کے ساتھ فراہم ہوتے ہیں تو وہ اپنے پروردگار کی اطاعت میں

ذرہ برابر کوتاہی نہیں کرتا۔

لیکن ابوذر کے پاس چند اونٹ اور کچھ گوسفند تھے جن کا دودھ پی کر وہ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اگر کبھی ان کے دل میں گوشت کھانے کی خواہش پیدا ہوتی یا ان کے گھر کوئی مہمان وغیرہ آجاتا یا کسی فقیر و محتاج کی ضرورت کا احساس کرلیا تو ان جانوروں کے گوشت سے فائدہ حاصل کرلیا کرتے تھے۔ گوشت کو دوسرے لوگوں میں تقسیم کرتے وقت وہ اپنا حصہ نکال لیا کرتے تھے۔

ذرا سوچو کہ ان لوگوں سے بڑا متقی اور پرہیزگار کون تھا؟ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے ان ساتھیوں کی فضیلت کے سلسلے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے تم سبھی لوگ بخوبی واقف ہو اور ان لوگوں نے زہد و تقویٰ کے نام پر اپنا سب کچھ کبھی نہیں لٹایا۔ اور آج تم لوگ جس طرز زندگی کی تجویز اور تبلیغ کر رہے ہو کہ لوگ اپنے اہل و عیال کی کوئی فکر نہ کرتے ہوئے اپنی تمام ملکیت سے دستبردار ہو جائیں اور ترک دنیا اختیار کریں مگر اس راستے پر رسول خدا کے اصحاب کبھی نہیں چلے۔

"میں تم لوگوں کو ضمانت کے ساتھ یہ حدیث بیان کرتا ہوں جو میرے والد اور ان کے اجداد نے رسول خداؐ سے روایت کی ہے اور میں خبردار کرتا ہوں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

"مومن عجیب و غریب صفات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کے جسم کو بوٹی بوٹی کاٹ ڈالا جائے پھر بھی اس کے لئے خیر و سعادت ہی ہوگی۔ اور اگر اس کو مشرق و مغرب کے تمام ملک عطا کر دیئے جائیں تو بھی اس کے لئے خیر و

سعادت ہی ہوگی ۔ یعنی مفلوک الحال اور مال و دولت کی فراوانی مومن کی سعادت پر اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔

کیا مومن کی خیر و سعادت اسی میں ہے کہ وہ فقیر و تہی دست ضرور ہو؟ مومن کی بلندی اس کی روح اس کے ایمان اور عقیدے سے ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ چاہے فقیری اور تنگ دستی کا عالم ہو یا مال و دولت کی فراوانی ہو، ہر عالم میں اسے اپنے فرائض کا علم رہا کرتا ہے ۔ اور وہ ان فرائض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا کرتا ہے ۔ یہی وہ عجیب و غریب صفات ہیں جو مرد مومن میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے ہر قسم کی پریشانی و سختی اور آرام و آسائش اس کے لئے خیر و سعادت بن جایا کرتی ہے ۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس موضوع پر اب تک میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ تمہارے لئے کافی ہے یا اس سلسلے میں اور بھی کچھ بیان کروں؟"

تم جانتے ہو کہ صدر اسلام میں جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، تو جہاد کا قانون یہ تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں کا مقابلہ کرے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تھا تو اسے گنہگار، نافرمان اور مجرم شمار کیا جاتا تھا لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور لشکر کفار سے جہاد کے لئے وسائل و امکانات کی فراوانی ہو گئی تو پروردگار عالم نے اپنی رحمت و مہربانی کے ذریعہ اس قانون میں یہ تبدیلی پیدا کر دی کہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ دو کافروں کا مقابلہ کرے نہ ان سے زیادہ کے ساتھ۔"

میں تم لوگوں سے اسلام کے عدالتی نظام اور مجرم کی سزا وغیرہ کے بارے میں سوال کرتا ہوں کہ اسلام نے مظلوم کو انصاف دلانے اور مجرم کی سزا کے سلسلے میں کیا قوانین مرتب کئے ہیں۔ فرض کرو کہ تم میں سے کسی ایک کے خلاف اسلامی عدالت میں تمہاری بیوی کے نان ونفقہ کے سلسلے میں کوئی معاملہ درپیش ہے۔ اور قاضی یہ حکم صادر کرتا ہے کہ تم اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرو۔ تو یہ بتاؤ کہ تم اس سلسلے میں کیا عذر پیش کروگے اور اپنی بیوی کا نفقہ کیسے ادا کروگے۔ کیا تم یہ عذر پیش کروگے کہ میں زاہد آدمی ہوں اور میں نے مال ومتاع دنیوی سے کنارہ کشی اختیار کی ہے؟ اور کیا تمہارا یہ عذر قابل قبول اور مناسب ہوگا؟ کیا تمہارے عقیدے کے مطابق قاضی کا یہ حکم کہ تم اپنی بیوی کا نفقہ ادا کرو، حق اور انصاف پر مبنی نہیں بلکہ ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر ہے؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ قاضی کا یہ حکم ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم سفید جھوٹ بول رہے ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنی اس دروغ گوئی کے ذریعے تمام اہل اسلام کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کا م لے رہے ہو۔ اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ قاضی کا حکم صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا عذر ناقابل قبول اور باطل ہے۔ پس تم یہ تسلیم کرلو کہ تمہارا مسلک اور طرز زندگی باطل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ زندگی میں بیشتر مواقع ایسے ہیں جن میں مسلمان بہت سے واجب اور غیر واجب اخراجات انجام دیتا ہے۔ مثلاً کبھی اسے زکات ادا کرنی ہوتی ہے تو کبھی کفارہ دینا پڑتا ہے۔ پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تمہاری من پسند اصطلاح کے مطابق تمام لوگ زاہد ہوگئے اور سبھی لوگوں نے زندگی در زندگی کی ضرورتوں سے روگردانی بھی اختیار کرلی۔ تو ایسی صورت میں واجب

صدقات اور کفارات کا کیا ہوگا ؟ واجب زکات کا فریضہ سونا، چاندی، گوسفند، اونٹ، گائے، دیگر پالتو جانور، خرما، کشمش وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ پس ان چیزوں پر واجب صدقے کا کیا ہوگا ؟ کیا زکات کو اس لئے واجب نہیں قرار دیا گیا کہ غریب اور نادار لوگوں کی زندگی کو بہتر بنایا جائے اور مرد مفلس بھی خوشحالی کی زندگی بسر کرسکے۔ اور مواہب زندگی سے بہرہ مند ہوسکے۔ یہ خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان تمام پابندیوں سے دین کا مقصد یہ ہے کہ انسان تحفۂ زندگی تک پہونچ جائے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکے۔ اور زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکے۔ اگر دین کا مقصد فقیری اور ترک دنیا ہوتا اور دینی تعلیم و تربیت کی آخری منزل یہ ہوتی کہ انسان دنیا اور دنیاوی مال و متاع سے کنارہ کشی اختیار کرے اور فقر و مفلسی کی زندگی کو ترجیح دے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ فقرأ و مساکین نے زندگی کے بلند اور اعلیٰ مقاصد حاصل کرلئے پس انھیں کوئی چیز نہ دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنے عمدہ اور سعادت مندانہ حالات سے الگ نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے کو سعادت اور معراج زندگی کا مالک سمجھ کر فقیروں کو بھی چاہیے کہ وہ کسی کی بخشش کو قطعی قبول نہ کریں تاکہ ان کے سعادت مندانہ حالات برقرار رہ جائیں۔

پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ تم جو کچھ کہتے ہو اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو کسی شخص کو اپنا مال اپنے پاس رکھنا قطعی مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اسے چاہیے کہ اپنا سارا مال دوسروں کو بخشش دے۔ اور اس اعتبار سے زکات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

پس معلوم یہ ہوا کہ تم لوگ نہایت خراب اور خطرناک راستے پر چل رہے ہو۔ اور ایک خراب مسلک کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہو۔ تم جس مسلک پر چل رہے ہو اور جس پر چلنے کے لئے دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دے رہے ہو اس پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی بنیاد جہالت، قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت اور سنت و احادیث پیغمبرؐ سے لاعلمی پر قائم ہے۔ یہ وہ احادیث نہیں ہیں جنھیں شک کی نگاہ سے دیکھا جا سکے بلکہ یہ وہ احادیث ہیں جنکی صحت اور سچائی پر خود قرآن مجید گواہ ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہا جائے کہ تم ہر اس مستند اور معتبر حدیث کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہو جس سے تمہارے مسلک کی تردید ہوتی ہے یا جو تمہارے مسلک کے خود ساختہ اصولوں کے مطابق نہیں ہوتی اور یہ تمہاری دوسری بڑی بیوقوفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ تم لوگ قرآنی آیات میں پوشیدہ لطیف اور حیرت انگیز نکات پر نہ غور کرتے ہو اور نہ ہی ان سے فائدہ حاصل کرتے ہو۔ تم علوم قرآن میں ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کے درمیان پائے جانے والے فرق سے بھی ناواقف ہو اور امر و نہی کے درمیان تمیز بھی نہیں کر پاتے۔

تم قصۂ سلیمان بن داؤد کے بارے میں مجھے جواب دو جنھوں نے پروردگار عالم سے ایسے ملک طلب کیا تھا جس سے بالاتر ملک کسی دوسرے کو میسر نہ ہو سکے۔[1] اور پروردگار نے انھیں ویسا ہی ملک عطا بھی کیا۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر

---

[1] قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ

سلیمانؑ حق کے علاوہ اپنے اللہ سے اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ نہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں اور نہ ہی کسی مردِ مومن نے سلیمان کی اس خواہش کو عیب پر مبنی بتایا۔ اور آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ آخر سلیمان نے اس دنیا میں ایسے وسیع اور عدیم المثال ملک کی خواہش کیوں کی۔ اسی طرح سلیمان سے پہلے داؤدؑ کا واقعہ ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح داستان یوسف میں حضرت یوسف بادشاہِ وقت سے سرکاری طور پر یہ کہتے ہیں۔ "ملک کی خزانہ داری کا کام میرے سپرد کر دے کیونکہ میں امین بھی ہوں اور دیانت دار بھی۔" اس کے بعد منزل یہ آگئی کہ مصر سے لیکر یمن تک پھیلا ہوا وسیع ملک اور اس کا تمام انتظام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اطراف و اکناف میں قحط پھیلا ہوا تھا۔ لوگ انکی حکومت سے غلہ وغیرہ خرید کر واپس چلے جایا کرتے تھے۔ البتہ اس میں کوئی رائے نہیں کہ نہ یوسفؑ نے کوئی ناحق یا غیر منصفانہ کام کیا اور نہ ہی یوسفؑ نے اپنے کسی کام سے عیب جوئی کا کوئی موقع فراہم ہونے دیا۔ اسی طرح قصہ ذوالقرنین بھی ہے، جس میں ایک بندہ اپنے اللہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اللہ بھی اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ چنانچہ چشم زدن میں تمام دنیاوی اسباب فراہم ہو گئے اور وہ مشرق و مغرب کا مالک بن گیا۔

اے حضرات صوفیہ[1]! اس ناجائز اور خطرناک مسلک سے کنارہ کشی اختیار کر لو اور اسلام کے حقیقی اصولوں پر پوری طرح کاربند ہو جاؤ۔ خداوند عالم نے جن چیزوں کے بارے میں امر و نہی کی ہے اس سے تجاوز نہ کرو اور خود ساختہ احکام

---

[1] تحف العقول ص ۳۴۸، ۳۵۲، اصول کافی جلد ۵ باب المعیشہ ص ۶۵ تا ۷۱

مت صادر کرو۔ جن مسائل کے بارے میں تمھیں علم نہیں ہے اس میں قطعی مداخلت نہ کرو۔ اور ان مسائل کا علم اہل علم سے حاصل کرو۔ ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور حلال و حرام کا علم حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہو۔ صرف یہی نہیں کہ یہ معلومات تمہارے لئے بہتر اور سودمند ہیں بلکہ تمہیں بیوقوفی اور نادانی سے چھٹکارا دلادیں گی۔ جہالت سے کنارہ کشی اختیار کرلو کیونکہ اس کی طرفداری کرنے والوں کی کثرت ہے اور اس کے برعکس عقل و دانش کی حمایت کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ دانشمندی ہر دانشمند سے بالاتر ہے۔[۱]

۱۔ تحف العقول، ص ۳۴۸ - ۳۵۴ ۔ دکافی، جلد ۵، باب ۔ المعیشہ ص ۶۵-۷۱

(۱۶)

حضرت علیؑ اور عاصم

جنگ جمل[1] کے خاتمہ کے بعد حضرت علی علیہ السلام شہر بصرہ میں داخل ہوئے۔ شہر بصرہ میں قیام کے دوران ایک روز اپنے ایک دوست علاء بن زیاد حارثی کی عیادت کے لئے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ اس شخص کا مکان نہایت وسیع اور عالیشان تھا۔ حضرت علیؑ نے اپنے دوست کے مکان کی وسعت اور خوبصورتی کو دیکھ کر اس سے یوں مخاطب ہوئے۔ "اتنا وسیع اور عالیشان مکان اس دنیا میں آخر کس کام کا جبکہ تو آخرت میں ایک وسیع مکان کا زیادہ احتیاج رکھتا ہے! لیکن اگر تو چاہے تو دنیا میں اپنے اس مکان کو آخرت کے شاندار مکان کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ تو اپنے اس مکان

---

[1] جنگ جمل شہر بصرہ کے قریب ہوئی تھی۔ اس جنگ میں ایک طرف امیرالمومنین علی علیہ السلام اور دوسری طرف عائشہ، طلحہ اور زبیر تھے۔ اس کو جنگ جمل اس لئے کہا جاتا ہے کہ عائشہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر علیؑ کے خلاف لڑنے والے لشکر کی قیادت کر رہی تھیں۔ عربی زبان میں جمل کے معنی اونٹ ہوتے ہیں۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے فوراً ہی بعد عائشہ، طلحہ اور زبیر نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف یہ جنگ چھیڑی جس کا سبب یہ تھا کہ اپنی عادلانہ سیرت کی وجہ سے علیؑ طبقہ اشراف کے حق میں کسی امتیاز کے قائل نہ تھے۔ اس جنگ میں علی علیہ السلام کی فتح ہوئی۔

میں مہمانوں کی خوب پذیرائی کیا کر، لوگوں کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آیا کر اس گھر میں مسلمانوں کے جو حقوق ہیں انھیں ادا کیا کر اور لوگوں کو ان کا حق دلانے میں ہر ممکن مدد کیا کرتا کہ لوگ اس گھر کو حق اور انصاف حاصل کرنے کا ذریعہ تسلیم کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ تو اپنے اس گھر کو ذاتی مفاد کے لئے ہی نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے فائدہ کا ذریعہ بنا دے تاکہ اس سے تیری نفسانی خواہش کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکے۔"

علاء : "یا امیر المومنین! میں آپ سے اپنے بھائی عاصم کے بارے میں شکایت کرنا چاہتا ہوں ؎۔"

"تمہاری شکایت کیا ہے؟"

"اس نے دنیا کو ترک کر دیا اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی ہے۔ اب اس کا اس دنیا اور دنیا کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اس کو میرے سامنے حاضر کرو۔"

عاصم کو ان کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت علیؑ نے اس کو مخاطب

؎ اس داستان کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں صفحہ ۱۹ (چھاپ بیروت) پر نقل کیا ہے۔ لیکن علاء بن زیاد کی جگہ پر انھوں نے ربیع بن زیاد کا نام لکھا ہے داستان کے متن میں ابن ابی الحدید ربیع بن زیاد کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے یوں لکھتے ہیں: واما العلاء بن زیاد الذی ذکرہ الرضی فلا اعرفہ ولعل غیری یعرفہ (لیکن علاء بن زیاد جس کو شریف رضی نے اس داستان میں ذکر کیا ہے، میں اس بارے میں لاعلم ہوں اور شاید دوسرے لوگ اسکو جانتے ہیں)

کرتے ہوئے کہا۔"اے اپنی جان کے دشمن! شیطان نے تیری عقل چھین لی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اپنی بیوی اور بچے پر کیوں رحم نہ آیا؟ کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ جس پروردگار نے دنیا کی پاکیزہ نعمتوں کو تیرے لیے حلال اور جائز قرار دیا ہے وہ اس وجہ سے ناراض ہو جائے گا کہ تو ان نعمتوں سے فائدہ حاصل کر رہا ہے؟ تو پروردگار کے نزدیک اس سے زیادہ چھوٹا ہے۔"

عاصم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔"یا امیر المومنینؑ! آپ بھی تو میری طرح ہیں۔ آپ بھی اپنے اوپر مصائب اور سختیاں برداشت کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو نہایت پریشانی اور مفلسی میں بسر کر رہے ہیں۔ آپ بھی تو عمدہ اور نرم لباس نہیں پہنتے اور لذیذ غذائیں نہیں استعمال کرتے۔ اس طرح میں بھی وہی کام انجام دے رہا ہوں جو آپؑ کرتے ہیں اور وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے جس پر آپ بھی گامزن ہیں۔"

"اے عاصم! تم غلطی کر رہے ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان فرق ہے۔ میں جس عہدہ پر ہوں اس پر تم نہیں ہو۔ میں امت کے قائد، حاکم اور پیشوا کی حیثیت رکھتا ہوں اور حاکم و پیشوا کی زندگی اور ذمہ داریاں عام لوگوں سے علیحدہ ہوا کرتی ہیں۔ یعنی حاکم کی جو ذمہ داری ہے وہ عام شہری کی نہیں ہے۔ خداوند عالم نے عادل حاکموں کے لیے یہ واجب قرار دیا ہے کہ وہ اپنی قوم کے کمزور اور پسماندہ ترین طبقے کی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ذاتی زندگی بسر کریں۔ حکم خداوندی کے مطابق انصاف پسند حاکم کو اس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے جس طرح غریب اور مفلس عوام زندگی بسر کرتے ہیں۔ تاکہ مفلس اور پسماندہ

طبقے کو صدمہ نہ ہو اور غریبی کا احساس ان کے دل و دماغ کو متاثر نہ کرسکے اس لحاظ سے میری ذمہ داری کچھ اور ہے اور تمہاری ذمہ داری کچھ اور۔ یعنی دونوں ذمہ داریوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔" ؎۱

؎۱ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۷

(۱۷)

محتاج اور دولت مند

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسب معمول اپنے گھر میں بیٹھے تھے اصحاب اور دوستوں نے ان کے اردگرد اس طرح حلقہ کر رکھا تھا جیسے انگوٹھی کے درمیان نگینہ ہو۔ اسی اثنا میں ایک مفلس اور گدڑی پوش مسلمان مجلسِ رسول میں داخل ہوا اور اسلامی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کی روشنی میں ہر شخص کو برابر کا درجہ حاصل ہے اور آدابِ مجلس کی رو سے، نو وارد کو جہاں خالی جگہ ملے اسی جگہ بیٹھ جانا چاہیے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ فلاں جگہ میری شان و شوکت کے مطابق نہیں ہے، وہ غریب مسلمان اپنے بیٹھنے کے لیے خالی جگہ تلاش کرنے لگا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو ایک کونے میں اسے خالی جگہ نظر آئی۔ لہٰذا نہایت خاموشی کے ساتھ وہ وہاں پر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس کے قریب ایک دولت مند شخص پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس غریب مسلمان کو اپنے قریب بیٹھا ہوا دیکھ کر اس دولت مند آدمی نے اپنے قیمتی کپڑے سمیٹے اور کنارے ہٹ گیا۔ رسولِ مقبول بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دولتمند آدمی کا یہ اخلاق دیکھ کر پیغمبر اسلام نے اسے مخاطب کیا اور کہا:

" تو ڈر گیا کہ کہیں اس کی مفلسی اور فقیری کا سایہ تیرے اوپر نہ پڑ جائے؟"
" نہیں ، یا رسول اللہؐ! نہیں ۔"

"پھر آخر کیا بات تھی جس کی وجہ سے تو اس مفلس آدمی کو دیکھتے ہی ایک کنارے ہٹ گیا ؟"

" اے اللہ کے رسولؐ ! مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں ۔ اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور کفارہ کی صورت میں میں اپنی ملکیت کا آدھا حصّہ اپنے اس غریب اور مفلس بھائی کو عطا کر دینا چاہتا ہوں"

دولت آدمی کی یہ بات سن کر وہ غریب مسلمان بول پڑا۔" لیکن میں اسے قبول کرنے کے لیے قطعی آمادہ نہیں ہوں ۔"

مجلسِ رسولؐ میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے دریافت کیا:" آخر کیوں ؟"

" میں ڈرتا ہوں کہ کہیں دولت کی فراوانی ایک دن مجھے بھی اتنا مغرور نہ کر دے کہ میں بھی اپنے دوسرے مفلس مسلمان بھائی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے لگوں جیسا اس شخص نے آج میرے ساتھ کیا ہے۔"[1]

---

[1] اصول کافی ، جلد دوم ۔ باب فضل فقراء المسلمین ۔ ص ۲۶۰

۱۸

ایک راہی اور ایک دوکاندار

ایک بلند قامت اور چوڑی ہڈیوں والا شخص بازار کوفہ سے گزر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور مضبوط جسم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس بہادر شخص نے میدان جنگ میں یقیناً ایک مثالی شجاعت اور غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا ہوگا۔ چہرے پر ایسی علامتیں موجود تھیں جنھیں میدان کارزار کی یادگار کہا جاتا ہے۔ اس کی آنکھ کے اردگرد حلقے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اور بازار سے گزرتے وقت بھی اس کے چہرے سے غیر معمولی اطمینان کی جھلک مل رہی تھی۔ دوسری طرف ایک دوکاندار نے اپنے ساتھیوں کو ہنسانے کے لیے ایک مٹھی کوڑا اس کے اوپر پھینک دیا۔ دوکاندار کی اس نازیبا حرکت پر اس راہ گیر نے غم و غصہ کا اظہار نہ کیا اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اس طرح آگے قدم بڑھاتا چلا گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ جب وہ راہی کچھ دور چلا گیا تو دوکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے ساتھی نے کہا۔ "کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ جس راہی کے اوپر کوڑا پھینک کر تو نے اس کی اہانت کی ہے وہ کون ہے؟" "نہیں، میں نے تو اس شخص کو قطعی نہیں پہچانا۔ میں نے

تو یہ خیال کیا ہزاروں دوسرے راہ گیروں کی طرح یہ بھی ایک راہ گیر ہے۔ اگر تجھے معلوم ہو تو بتا کہ یہ شخص کون تھا؟"

"واقعی تو نے نہیں پہچانا۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ لشکر اسلام کے مشہور سپہ سالار اور کمانڈر مالک اشتر نخعی تھے۔"

"تعجب ہے۔ یہ مشہور سپہ سالار مالک اشتر تھے؟" وہی مالک اشتر جن کے خوف سے شیر کا کلیجہ پانی پانی ہو جاتا ہے۔ اور جن کا نام سن کر دشمن لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے۔"

"ہاں! ہاں! یہ وہی مالک اشتر تھے جن کی بہادری کے گن گائے جاتے ہیں۔"

"ہائے افسوس! میں نے تو بہت بڑی خطا اور گستاخی کی ہے۔ ابھی ابھی یہ حکم صادر کردیں گے کہ مجھے میری خطا کی سزا دی جائے۔ میں اسی وقت ان کے پیچھے دوڑتا ہوں اور ان کا دامن پکڑ کر یہ التماس کرتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دیں۔ مجھ سے انجانے میں یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوکاندار مالک اشتر کے پیچھے دوڑنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ مالک اشتر ایک مسجد کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ دوکاندار ان کے پیچھے پیچھے مسجد میں داخل ہوا، تو کیا دیکھتا ہے کہ مالک نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی جگہ انتظار کرتا رہا۔ نماز ختم ہوتے ہی وہ دوکاندار مالک اشتر کے سامنے پہونچا اور انتہائی شرم و خاکساری کے ساتھ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "میں وہی شخص ہوں جس نے اپنی نادانی اور نادانستگی کی وجہ سے آپکی شان میں گستاخی کی ہے۔" مالک نے اس شخص کو جواب دیتے

ہوئے کہا "خدا کی قسم میرا مسجد آنے کا قطعی ارادہ نہ تھا ، میں تو صرف تیری خاطر یہاں آیا ہوں ۔ کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تو بہت نادان ، جاہل ، اور گمراہ آدمی ہے اور لوگوں کو بے مقصد تکلیف پہونچایا کرتا ہے ۔ تیری زیادتی دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا اور میں فوراً ہی مسجد کی طرف چلا آیا کہ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ عالیہ میں تیرے لیے دعا کروں کہ وہ تجھے راہ راست کی ہدایت کرے میرا وہ ارادہ نہیں تھا جس کا خوف تجھے یہاں تک لے آیا ہے ۔" [1]

---

[1] سفینۃ البحار ، مادہ شتر نقل از مجموعہ ورام

maablib.org

۱۹

غزالی اور کچھ لٹیرے

اسلامی علوم کے مشہور و معروف دانشمند غزالی طوس کے رہنے والے تھے۔ طوس ایک گاؤں کا نام ہے جو مشہد کے قریب واقع ہے۔ اس زمانے میں نیشاپور اسلامی تعلیمات کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ پانچویں صدی ہجری کی بات ہے کہ شہر نیشاپور نے دارالعلم کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اور علاقے کے تمام طالب علم اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ غزالی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیشاپور تشریف لے گئے اور عرصہ دراز تک جلیل القدر علماء و اساتذہ کی سرپرستی میں مخصوص لگن اور علمی تڑپ کے ساتھ درس حاصل کرتے رہے۔ ان کا معمول تھا کہ ماہرین علم و ادب کی خدمت میں بیٹھ کر انھیں جو کچھ حاصل ہوتا اسے وہ لکھ کر اپنے پاس محفوظ کرلیا کرتے تھے تاکہ وہ درس فراموش نہ ہونے پائے اور ضرورت کے وقت اس سے مزید استفادہ کیا جاسکے۔ اس طرح اپنی طالب علمی کے زمانے میں غزالی نے مختلف علوم و فنون پر مشتمل ایک گرانقدر علمی ذخیرہ جمع کرلیا

جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

کئی برس تک نیشاپور میں طلب علمی کی زندگی بسر کرنے کے بعد جب غزالی نے وطن واپسی کا قصد کیا تو اپنا سارا علمی ذخیرہ اکٹھا کیا اور اسے ایک گٹھری بنائی اور اسے اپنے ہمراہ لے کر وطن کے لیے روانہ ہوگئے۔

راستے میں کچھ لٹیروں نے اس قافلے پر حملہ کر دیا جس کے ساتھ غزالی وطن واپس لوٹ رہے تھے۔ ڈاکوؤں نے قافلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لوگوں کا ساز و سامان اور مال و دولت لوٹ لوٹ کر ایک جگہ جمع کرنے لگے۔

اس طرح تھوڑی دیر بعد غزالی اور ان کے سامان کی باری آگئی لٹیرے غزالی کے پاس پہونچ گئے اور ان کی گٹھری چھین ہی لینا چاہتے تھے کہ غزالی لٹیروں کے سامنے رونے گڑگڑانے لگے اور ڈاکوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "دیکھو! اس گٹھری کے علاوہ تم لوگ جو کچھ بھی لینا چاہتے ہو لے جاؤ مگر میرا التماس ہے کہ اسے میرے ہی پاس چھوڑ دو۔"

غزالی کی بات سن کر لٹیروں نے خیال کیا کہ لگتا ہے اس گٹھری میں مال زیادہ ہے اسی وجہ سے یہ شخص اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا۔ لہٰذا ان لوگوں نے اس گٹھری کو چھین لیا اور جب اسے کھول کر دیکھا تو انھیں لکھے ہوئے کاغذوں کے ذخیرہ کے علاوہ اسمیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اور غزالی کو مخاطب کرتے ہوئے لٹیروں نے کہا۔ آخر اس گٹھری میں ایسی کونسی چیز

دولت تھی جس کی حفاظت کے لیے تم اس طرح گڑگڑا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کاغذوں سے تمہیں کیا حاصل ہو جائے گا۔ آخر یہ کاغذ تمہارے کس کام کے ہیں؟"

غزالی نے جواب دیا کہ "اس گٹھری میں جو کچھ بھی ہے وہ یقیناً تمہارے کسی کام کا نہیں ہے لیکن میرے لیے یہ انتہائی بیش قیمت اور سود مند سرمایہ ہے۔"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر یہ کاغذات تمہارے کس کام کے ہیں؟"

"یہ کاغذات میری اب تک کی طالب علمانہ زندگی کا گرانقدر سرمایہ ہیں جنھیں میں نے بلند مرتبہ اساتذہ کی مدد سے جمع کیا ہے۔ اگر تم لوگوں نے میری یہ دولت مجھ سے چھین لی تو میری معلومات تباہ ہو کر رہ جائیں گی۔ اور میری کئی برس کی محنت بیکار ہو جائے گی۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تیری ساری معلومات اسی گٹھری میں ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ علم جسے کسی گٹھری یا صندوق میں بند کیا جا سکے، وہ علم جسے چور اٹھا لے جا سکتے ہوں، وہ درحقیقت علم نہیں ہے۔ جاؤ اور اپنی نادانی پر غور و فکر کرو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ علم ہی کیا جسے چور چرا لے جائے۔"

ڈاکو کی اس سادہ اور عامیانہ گفتگو نے غزالی جیسے ہونہار اور محنتی طالب علم کے دل و دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ وہ غزالی جو اب تک استاد کے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو اپنی کاپی میں فوراً ہی نوٹ کر لیا کرتے تھے وہ اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ غور و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن و دماغ

کی پرورش کریں۔ اور تحقیق و تجزیہ کے بعد مفید معلومات کو اپنے ذہن کی کاپی میں نوٹ کر لیا کریں۔

غزالی کا بیان ہے: "ڈاکو کی زبان سے نکلنے والی بات میرے لیے بہترین نصیحت ثابت ہوئی اور اس نصیحت نے میری فکری زندگی کی رہنمائی بھی کی۔[1]"

---

[1] غزالی نامہ، ص ۱۱۶

۲۰

ابن سینا اور ابن مسکویہ

ابو علی بن سینا نے بیس برس کی عمر میں اپنے دور کے جملہ علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی اور الٰہی، طبیعی، ریاضی اور دینی علوم میں اپنے دور کے ممتاز اور نامور علماء میں شمار کئے جانے لگے تھے۔ ایک روز وہ اس عہد کے مشہور و معروف عالم ابن مسکویہ کے درس میں تشریف لے گئے۔ اور نہایت غرور و گھمنڈ کے ساتھ ایک اخروٹ ابن مسکویہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اس اخروٹ کی سطح اور اس کا رقبہ کیا ہے؟

ابن مسکویہ نے علم اخلاق و تربیت پر اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب جس کا نام "کتاب طہارۃ الاعراق" تھا، ابن سینا کی طرف بڑھائی اور کہا۔ "تم پہلے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لو تا کہ میں اس اخروٹ کی سطح اور اس کا رقبہ نکال سکوں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اس اخروٹ کی سطح اور مساحت کی تعین میں کسی حد تک محتاج ہوں مگر مجھے یقین کامل ہے کہ تم علم اخلاق میں مجھ سے زیادہ محتاج ہو یعنی میں علم ریاضی میں اتنا محتاج نہیں ہوں جتنا تم علم اخلاق

میں محتاج ہو لہٰذا تمھیں اپنے اخلاق کی اصلاح کر لینی چاہیے۔"

ابو علی بن سینا ابن مسکویہ کی یہ بات سن کر بہت شرمندہ ہوئے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تمام عمر اس جملے کو راہ نمائے اخلاق کی حیثیت سے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔[1]

---

[1] تاریخ علوم عقلی در اسلام ص ۲۱۱

(۲۱)

نصیحتِ زاہد

گرمی کا موسم تھا۔ گرم ہوا اور دھوپ کی شدت سے شہر مدینہ اور اس کے اطراف کے تمام کھیت اور باغات بری طرح جھلس رہے تھے اسی اثنا میں محمد بن منکدر نامی ایک شخص جو اپنے آپ کو بہت بڑا متقی، پرہیزگار، زاہد، عبادت گذار اور تارکِ دنیا سمجھتا تھا، اتفاقاً کسی کام سے شہر مدینہ سے باہر نکلا تو اچانک اس کی نگاہ ایک ایسے تندرست آدمی پر پڑی جو کڑی دھوپ کی پرواہ کئے بغیر اپنے کچھ ساتھیوں کو لئے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس فربہ جسم شخص کے چلنے کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے کھیتی کی دیکھ بھال کے لئے جا رہا ہے اور ساتھ چلنے والے لوگ اس کے نوکر چاکر ہیں۔

اس مردِ زاہد نے سوچا۔ "یہ کون شخص ہے جس نے اس شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں بھی خود کو دنیا داری میں مشغول کر رکھا ہے؟" یہ سوچتے ہوئے وہ زاہد تیز قدموں کے ساتھ اس شخص کے قریب پہونچ گیا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا کہ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ محمد بن

علی بن الحسینؑ یعنی امام محمد باقر علیہ السلام ہیں۔

مرد زاہد پھر سوچنے لگا: "یہ شریف آدمی آخر اس قدر دنیا طلبی میں کیوں پڑا ہوا ہے؟ کچھ بھی ہو میرا تو یہ فریضہ ہے کہ اس شریف آدمی کو کچھ نصیحت کروں تاکہ وہ دنیا طلبی سے باز آجائے۔"

مرد زاہد امام باقرؑ کے قریب آگیا اور انھیں سلام کیا۔ امامؑ نے پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"کیا یہ مناسب ہے کہ آپ جیسا شریف انسان اس شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں دنیا طلبی کی وجہ سے گھر سے باہر نکلے۔ خصوصاً آپ جیسے فربہ جسم شخص کے لئے یہ دھوپ اور گرمی اور زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہوگی۔"

"موت کی خبر کس کو ہے؟ کون جانتا ہے کہ وہ کس وقت موت سے ہمکنار ہو جائے گا؟ شاید اسی وقت آپ کو موت آجائے۔ اور اگر خدا نخواستہ ایسی حالت میں موت آگئی تو آپ کی کیا حالت ہوگی؟ میرے خیال میں آپ جیسے آدمی کے لئے اتنی دنیاداری مناسب نہیں ہے۔ اور یہ آپ کے لئے زیبا نہیں ہے کہ اس شدید گرمی اور کڑی دھوپ میں اتنی تکلیف برداشت کریں۔ بہر حال میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ اتنی دنیاداری آپ جیسے آدمی کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے۔"

امام باقرؑ نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوست کے کندھے پر رکھا، دیوار کا سہارا لیا اور اس تارک دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اگر اس وقت موت آگئی تو میں حالت عبادت میں مروں گا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب

قرار دیے گئے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ شاید تجھے علم نہیں ہے کہ اس وقت میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ میں اطاعت و بندگی پروردگار ہے۔ تو یہ خیال کرتا ہے کہ صرف ذکر خدا، نماز اور دعا ہی عبادت پروردگار ہے۔ میری بھی اپنی زندگی ہے اور زندہ رہنے کے لیے اخراجات کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اگر میں محنت نہ کروں گا اور تکلیف نہ اٹھاؤں گا تو مجھے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے تیری اور تیرے جیسے دوسرے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ میں اس وقت طلب رزق اور تلاش معاش کے لیے جارہا ہوں تاکہ مجھے اپنے ضروری کاموں کے لیے دوسروں کا سہارا نہ لینا پڑے۔ اس وقت موت کے آنے کا خوف ہونا چاہئے جب انسان گناہ یا خلاف ورزی یا احکام الہٰی سے روگردانی کی حالت میں ہو، نہ اس وقت جب انسان خدا کی اطاعت میں مشغول ہو۔ میں اس وقت بھی اللہ کے حکم کی اطاعت کر رہا ہوں جس نے ہمارے لیے یہ واجب قرار دیا ہے کہ کسی دوسرے کے کندھوں کا بوجھ مت بنو بلکہ اپنی روزی اپنی محنت و مشقت سے حاصل کیا کرو۔"

زاہد نے کہا: "میں تو عجیب غلط فہمی اور نادانی کا شکار تھا۔ میں نے اپنے طور پر خیال کیا تھا کہ دوسرے کو نصیحت کروں گا اب پتہ چلا کہ میں خود ہی غلطی پر تھا۔ غلط طرز زندگی اختیار کر رکھا تھا اور اس کی اصلاح کی خاطر مجھے نصیحت کی سخت ضرورت تھی۔"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱، حالات امام باقرؑ ص ۸۲

(۲۲)

خلیفہ کے دربار میں

متوکل ایک ظالم عباسی خلیفہ تھا۔ وہ امام ہادی علیہ السلام کی عوام میں غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے بہت خوفزدہ رہا کرتا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی تھی، لوگ بڑے خلوص اور انتہائی عقیدت کے ساتھ حکم امام کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے پوری طرح آمادہ رہا کرتے تھے خلیفہ کے مشیر کاروں نے بھی اس سے یہ کہہ رکھا تھا کہ علی ابن محمدؑ یعنی امام ہادی علیہ السلام تیری حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان کے گھر سے ایسے خفیہ کاغذات اور اسلحے برآمد ہو جائیں جس سے مسلح بغاوت اور انقلاب کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ لہذا ایک رات جب سارا شہر نیند کی آغوش میں چلا گیا تو متوکل نے آدھی رات کے سناٹے میں اپنے کچھ جلاد صفت اور بے رحم ساتھیوں کو یہ حکم دیا کہ امام ہادی کے گھر کی تلاشی لیں اور اس کے بعد امام کو اس کے دربار میں حاضر کریں۔ متوکل نے یہ فیصلہ اس وقت لیا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے

ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا۔

بہر حال متوکل کا حکم سنتے ہی لوگ بڑی پھرتی سے امام ہادی کے گھر پہونچ گئے۔ ان لوگوں نے پہلے امام کو تلاش کرنا شروع کیا تو کیا دیکھا کہ وہ ریگ اور سنگ ریزہ پر بیٹھے ہوئے ذکر خدا اور اپنے پروردگار سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہیں۔ اس کے بعد خلیفہ کے غلاموں نے خانہ تلاشی کا کام شروع کر دیا۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر انھیں وہ نہ مل سکا جس کی تلاش تھی مجبوراً اس پر قناعت کی کہ امامؑ کو دربار خلافت میں پیش کر دیا جائے

جب امام دربار خلیفہ میں وارد ہوئے تو کیا دیکھا کہ شراب کی محفل جمی ہوئی ہے اور متوکل صدر محفل کی جگہ بیٹھا ہوا شراب نوشی میں معروف ہے۔ امام کو دیکھتے ہی اس نے حکم دیا کہ "انھیں ہمارے پہلو میں بٹھایا جائے بہرحال امام ہادیؑ خلیفہ کے بالکل قریب ہی بٹھا دیے گئے۔ متوکل نے شراب کا پیالہ امام کی طرف بڑھایا۔ انھوں نے انکار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "خدا کی قسم میں نے کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا لہذا تو مجھے معاف کر دے۔"

متوکل نے امام کا عذر قبول کر لیا اور اس کے بعد کہنے لگا۔ "اچھا اگر تم شراب نہیں پیتے تو کچھ شعر سناو۔ غزل کے پھڑکتے ہوئے اشعار پڑھکر ہماری اس محفل کی رنگینی اور رعنائی میں اضافہ کر دو اور ایسے عمدہ اشعار پیش کرو کہ حاضرین مجلس کی طبیعت مچل جائے۔"

امامؑ نے کہا: "اے متوکل! میں شاعر نہیں ہوں۔ البتہ دوسرے شعراء کے تھوڑے بہت اشعار مجھے ضرور یاد ہیں۔"

متوکل نے کہا، خیر کوئی بات نہیں، تمھیں جو کچھ بھی یاد ہو سناؤ میں تو اس وقت شعر سننا چاہتا ہوں۔"

امامؑ نے اشعار پڑھنے شروع کر دیے جس کا مضمون یہ ہے۔[۱]

- لوگوں نے اپنی رہائش کے لیے اونچے اونچے محل اور مضبوط قلعے تعمیر کرائے اور ہمیشہ مسلح افراد ان کی حفاظت کے لیے کھڑے رہا کرتے تھے لیکن ان مسلح سپاہیوں میں کوئی بھی موت سے مقابلہ نہ کر سکا اور نہ ہی مصائب روزگار سے ان کی حفاظت میں کامیاب ہو سکا۔
- آخر کار لوگ اونچے اونچے محلوں اور مضبوط قلعوں سے قبر کے گڑھے میں گھسیٹ لائے گئے اور نہایت بدبختی کے ساتھ قبر جیسے تنگ و تاریک گھڑے میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔
- ایسے حالات میں منادی نے فریاد کی اور ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" تمہاری وہ شان و شوکت، تمہارا وہ تخت و تاج اور

---

[۱]

باتوا علی قلل الاجبال تحرسهم	غلب الرجال فلم تنفعهم القلل
واستنزلوا بعد عز عن معاقلهم	واسکنوا حفرا یا بئس ما نزلوا
ناداهم صارخ من بعد دفنهم	این الاساور والتیجان والحلل
این الوجوه التی کانت منعمة	من دونها تضرب الاستار والکلل
فافصح القبر عنهم حین سائلهم	تلک الوجوه علیها الدود ینتقل
قد طال ما اکلوا دهرا وما شربوا	فاصبحوا الیوم بعد الاکل قد اکلوا

تمہارا وہ شکوہ و جلال کہاں چلا گیا؟

- وہ ناز و نعم میں پلے ہوئے چہرے کہاں چلے گئے جو بڑے ناز و نخوت سے ساتھ اطلس و دیبا کے پردوں کے پیچھے لوگوں کی نظروں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا کرتے تھے؟
- قبر نے ان کی عاقبت کو ذلیل و رسوا کر ڈالا۔ ناز و نعم میں پرورش یافتہ ان چہروں کو آخر کار اس مٹی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا جو کل ان کے پیروں کے تلے رہا کرتی تھی۔
- زمانہ دراز تک وہ لوگ دنیا میں طرح طرح کی چیزیں کھاتے پیتے رہے اور انواع و اقسام کی نعمتیں نگلتے رہے لیکن آج یہ زمین ان کو نگل گئی اور وہ لوگ مادر گیتی کے شکم میں اپنے اعمال کا بھگتان بھگت رہے ہیں۔

امامؑ نے اپنے مخصوص انداز میں یہ اشعار کچھ اس طرح پیش کیے کہ اہلِ مجلس اور خود متوکل کی روح کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ اشعار کے ختم ہوتے ہی محفل شراب نوشی میں شریک تمام لوگوں کا نشہ اتر گیا۔ متوکل نے شراب کا پیالہ زمین پر پٹک دیا اور اس کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس طرح شراب نوشی کی وہ محفل ختم ہو گئی۔ حقیقت کے نور نے ایک ظالم اور جلاد صفت حاکم کے دل پر چھائی ہوئی نخوت و غرور کی گرد کو صاف کر دیا اگرچہ اس کا اثر تھوڑی ہی دیر تک باقی رہا۔[۱]

---

[۱] بحار الانوار جلد دوم، احوال امام ہادی ص ۱۶۹

[۱] ص

(۲۳)

نماز عید

مامون ایک ہوشیار اور صاحب تدبیر عباسی خلیفہ تھا۔ اپنے بھائی محمد امین کو بھاری شکست دینے کے بعد اسے قتل کر دیا اور اس عہد کی وسیع خلافت کے تمام علاقے پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اپنی اس مہم کے سلسلے میں ابھی وہ مرو میں مقیم تھا۔ مرو اس زمانے میں خراسان کا ایک حصہ تھا۔ مرو سے مامون نے امام رضا علیہ السلام کے پاس ایک خط مدینہ روانہ کیا جس میں اس نے انھیں مرو آنے کی دعوت دی تھی۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے مختلف اسباب کی وجہ سے معذرت پیش کر دی کہ سر دست میں مدینہ چھوڑنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ مامون اپنی خواہش سے دست بردار نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے یکے بعد دیگرے امام کی خدمت میں کئی خطوط روانہ کئے اور ہر خط میں امام کو مرو تشریف لانے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس طرح یہ بات امام رضاؑ پر روشن ہو گئی کہ خلیفہ اپنی خواہش سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے۔ غرضکہ امام رضا علیہ السلام نے مدینے سے کوچ کیا اور مرو آ گئے۔

ان کے آتے ہی مامون نے یہ تجویز پیش کر دی کہ "آیئے اور خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیجئے۔ امام رضا علیہ السلام مامون کے ضمیر سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھیں سمجھنے میں تاخیر نہ ہوئی کہ اس تجویز کا مقصد صد در صد سیاسی پہلوؤں کا حامل ہے لہٰذا آپ نے عہدۂ خلافت کو قبول کرنے سے فوراً انکار کر دیا۔

اس تجویز پر بحث و گفتگو میں تقریباً دو ماہ کا زمانہ گزر گیا مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ایک طرف سے زور دار اصرار تھا تو دوسری جانب سے زبردست اور اٹل انکار۔

آخر کار جب مامون کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی تجویز ناقابل قبول ہے اور امام رضاؑ کو عہدۂ خلافت کے لئے قطعی راضی نہیں کیا جا سکتا تو اس نے ولی عہدی کی تجویز سامنے رکھ دی۔ امامؑ نے اس تجویز کو اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا کہ ان کے اوپر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی، عہدہ کی کوئی سرکاری حیثیت نہ ہوگی اور ملک کے کاروبار میں امام کوئی مداخلت نہ کریں گے مامون نے امام رضا علیہ السلام کی ان تمام شرطوں کو قبول کر لیا۔

اس کے بعد لوگوں سے امام رضاؑ کی ولی عہدی پر بیعت لی اور پورے ملک میں اس بات کا فرمان بھی جاری کر دیا۔ پھر مامون نے حکم صادر کیا کہ امام رضاؑ کے نام کے سکے چلائے جائیں اور ملک کے تمام ممبروں سے امامؑ کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جائے۔ چنانچہ ملک بھر میں مامون کے حکم کی اطاعت کی گئی۔

عیدقربان کا موقع آیا۔ چنانچہ مامون نے ایک شخص کو امامؑ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ "اس سال عید کی نماز آپ پڑھایئے تاکہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ولی عہد خلافت آپ ہیں"۔

امامؑ نے مامون کے پاس کہلا بھیجا کہ "ہمارے درمیان یہ عہدوپیمان ہوا تھا کہ میں کسی بھی سرکاری معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ لہذا میں اس کام کو انجام دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں"۔

مامون نے دوبارہ کہلا بھیجا کہ مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو نماز عید پڑھانے ضرور تشریف لے جائیں۔ تاکہ ولی عہدی کا معاملہ لوگوں کی نظر میں اور زیادہ صاف اور واضح ہو جائے۔ مختصر یہ کہ مامون نے اتنا اصرار کیا کہ امامؑ نے بالآخر یہ جواب دیا "اگر تو میری معذرت قبول کرلے تو بہتر ہے اور اگر نماز عید کے لیے میرا جانا لازمی ہے تو میں اس فریضۂ الٰہی کو اسی طرح ادا کروں گا جس طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام اس کو انجام دیا کرتے تھے"۔

مامون نے جواب دیا کہ آپ کو پورا اختیار ہے۔ جیسا چاہیں کریں مگر مصلحت وقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مسلمانوں کو عید نماز پڑھانے کے لئے آپ حتماً تشریف لے جائیں"۔

عید کی صبح فوج کے اعلیٰ افسران اور حکومت کے دیگر حکام وعوام نے خلفا کے دور میں پڑی ہوئی عادت کے مطابق نئے اور قیمتی

لباس زیب تن کئے پھر سجے سجائے گھوڑوں پر بیٹھ کر عید کی نماز میں شرکت کی غرض سے امام کے دروازے پر پہونچ گئے۔ عام مسلمانوں نے بھی نماز عید کی تیاری کی اور گلی کوچے میں کھڑے ہو کر جلالت مقام ولی عہد خلافت کی سواری کا انتظار کرنے لگے تاکہ عید گاہ تک ولی عہد کی ہمرکابی کا شرف انہیں بھی حاصل ہو جائے۔ بے شمار مرد اور عورتیں اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو گئے تھے تاکہ امام کی عظمت و شوکت کا قریب سے مشاہدہ کر سکیں۔ سب کی نگاہیں امامؑ کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور سبھی لوگ امام کی سواری کا انتہائی بیقراری کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

دوسری طرف حضرت امام رضاؑ مامون سے پہلے ہی یہ وعدہ لے چکے تھے اور اس شرط پر وہ نماز عید میں شرکت کے لئے آمادہ ہوئے تھے کہ وہ اس الٰہی فریضے کی ادائیگی میں خلفاء کی نہیں بلکہ رسول مقبولؐ اور علیؑ ابن ابیطالب کی سنت پر عمل کریں گے۔ لہٰذا صبح سب سے پہلے انھوں نے غسل کیا۔ سر پر سفید پگڑی باندھی، پگڑی کے ایک سرے کو سینے کی طرف لٹکایا اور دوسرے کو دونوں کندھوں کے درمیان چھوڑ دیا۔ پھر دامن کو ذرا اوپر اٹھایا اور پابرہنہ ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ بھی ایسا ہی کر لو۔ اس کے بعد انہوں نے وہ عصا اپنے ہاتھوں میں لیا جس کا اوپری حصہ لوہے کا تھا۔ اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھر سے باہر تشریف لائے۔ گھر سے باہر آتے ہی امامؑ

نے اسلامی سنّت کے مطابق نہایت بلند آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا
اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر !
لوگوں نے امام کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے بڑے زور و شور کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کیا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا زمین و آسمان اور ہر در و دیوار سے اللہ اکبر کی آواز نکل رہی ہے ۔ غرضکہ پورے ماحول میں تکبیر کی آواز پھیلی ہوئی تھی ۔ امامؑ نے تھوڑی دیر تک اپنے دروازے کے سامنے توقف کیا ۔ پھر نہایت بلند آواز میں یہ جملہ ارشاد فرمایا ۔
"اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر علی ماھدانا ۔ اللہ اکبر علی ما رزقنا من بھیمۃ الانعام الحمد للہ علی ما ابلانا ۔"
سبھی لوگ بلند آواز سے اور ایک دوسرے کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے اس جملے کو دہراتے رہے ۔ اور حالت یہ تھی کہ سب لوگوں پر شدید گریہ طاری تھا لوگوں کی آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو یہ گواہی دے رہے تھے کہ مجمع میں شریک ہر شخص کے جذبات جاگ اٹھے ہیں ۔ فوجی افسران اور دیگر حکام جو سرکاری اور قیمتی لباس پہن کر عمدہ گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور جنھوں نے اپنے طور پر یہ خیال کر رکھا تھا کہ ولی عہد خلافت نہایت شان و شوکت کے ساتھ فاخرانہ لباس پہن کر گھر سے باہر تشریف لے جائیں گے ۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ امام نہایت

سادہ لباس کے ساتھ گھر سے برہنہ پا برآمد ہوئے ہیں اور پوری طرح اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہیں، تو ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اور بے اختیاری کے عالم میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا زوردار نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے وہ سب لوگ اپنی سواریوں سے نیچے اتر پڑے اور اپنے اپنے جوتے اتار کر برہنہ پا بھی ہو گئے۔ بعض فوجی افسروں نے چاقو سے اپنے جوتوں کے تسمے کاٹ ڈالے تاکہ انھیں ننگے پیر ہونے میں تاخیر نہ ہو۔ ہر افسر کی یہی خواہش و کوشش تھی کہ وہ اپنے ساتھی سے پہلے ننگے پیر ہونے کی سعادت حاصل کرلے۔

امام رضاؑ اسی شان و شوکت کے ساتھ عیدگاہ کی طرف چل پڑے ابھی زیادہ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ شہر مرو میں ہر جگہ گریہ وزاری کی آواز بلند ہو گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ عوام کے جذبات بھڑک اٹھے ہیں۔ امام رضاؑ ہر دس قدم چلنے کے بعد کھڑے ہو جاتے اور چار مرتبہ نہایت زوردار آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے۔ اور لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ نہایت جوش و خروش کے ساتھ امام کا ساتھ دیتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا لوگوں کے دلوں میں پائی جانے والی مادی شان و شوکت اور ظاہری دھوم دھام اور سجاوٹ کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے اور ہر شخص پر الٰہی تصورات پوری طرح غالب ہو چکے ہیں۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر مامون تک پہونچ گئی۔ ساتھیوں نے

مامون کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر یہ حالات تھوڑی دیر اور برقرار رہے اور علی ابن موسیٰ مصلیٰ تک پہونچ گئے تو انقلاب کا خطرہ لاحق ہو جائے گا مامون یہ خبر سن کر کانپ اٹھا۔ اور فوراً ہی امام رضاؑ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا کہ آپ واپس آجائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی صدمہ پہونچ جائے امامؑ نے اپنے کپڑے اور جوتے طلب کئے اور انھیں پہن کر گھر واپس لوٹ آئے اور کہنے لگے کہ میں نے تو پہلے ہی کہلایا تھا کہ مجھے اس کام سے معذور رکھا جائے۔" ؎

؎ بحار الانوار جلد ۱۲ ، حالات حضرت رضاؑ ص ۳۹

(۲۴)

بچّہ ماں کی دعا پر کان لگائے رہا

شب جمعہ تھی۔ ماں قبلے کی طرف منہ کئے ہوئے عبادت الہی میں ہمہ تن محو تھی اور بچہ ماں کے منہ سے نکلنے والے ہر جملے پر کان لگائے ہوئے تھا۔ کم سنی کے باوجود وہ ماں کے رکوع و سجود اور قیام و قعود کو بڑی توجہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ وہ کان لگائے سن رہا تھا کہ اس کی ماں تمام مسلمان مرد و عورت کے لئے دعائے خیر میں لگی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایک کا نام لیتی ہے اور پروردگار عالم سے ان سب کی سعادت و برکت اور نیکی و بھلائی کی خواہاں ہے۔ بچہ ماں کی دعا پر کان لگائے رہا کہ وہ بارگاہ قادر متعال سے اپنے لئے کیا مانگتی ہے؟

امام حسن علیہ السلام رات بھر جاگتے رہے اور اپنی والدۂ گرامی صدیقہ مرضیہ علیہا سلام کو غور سے دیکھتے رہے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں والدۂ گرامی بارگاہ عالیہ میں اپنے لئے کیا دعا کرتی ہیں اور پروردگار سے اپنے لئے کیا خیر و برکت طلب کرتی ہیں؟

رات گزر گئی اور ان کی ماں ساری رات دیگر مسلمان مرد و عورتوں کے بارے میں دعا کرتی رہیں۔ مختصر یہ کہ عبادت و دعا میں صبح ہو گئی مگر امام حسن علیہ السلام نے والدہ کو اپنی ذات کے بارے میں دعا کرتے ہوئے نہ سنا چنانچہ انھوں نے صبح ہوتے ہی والدہ کی خدمت میں دست بستہ عرض کیا "والدۂ گرامی! میں رات بھر کان لگائے سنتا رہا مگر آپ پروردگار عالم صرف دوسروں کے لئے دعا کرتی رہیں۔ آخر آپ نے اپنے لئے کوئی دعا کیوں نہیں مانگی؟

ماں نے بچے کو پیار بھرے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے نہایت مختصر سا جواب دیا۔ "میرے فرزند عزیز! پہلے پڑوسی اور ہمسایہ بعد میں اپنا گھر"[1]

---

[1] "یا بنی الجار ثم الدار" بحار الانوار جلد ۱۰ ص ۲۵

maablib.org

۲۵

قاضی کے حضور میں

شکایت کرنے والے نے اپنے دور کے خلیفۂ مقتدر عمر ابن خطاب کے دربار میں اپنی شکایت پیش کردی، قاعدے کے مطابق دونوں گروہ کے لوگوں کو دربار عدالت میں حاضر ہونا تھا تاکہ مقدمے کی سنوائی کی جاسکے، جس کی شکایت کی گئی تھی امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے، عمر نے مسندِ خلافت پر بیٹھ کر دونوں طرف کے لوگوں کو دربار میں طلب کیا، اسلامی احکام کے مطابق دونوں گروہ کے لوگوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھنا چاہیے تاکہ اس چیز میں کوئی شک پیدا نہ ہونے پائے کہ عدالت کی نگاہ میں سب لوگ برابر ہیں۔ خلیفہ نے مدعی کو اس کے نام سے پکارا اور حکم دیا کہ معینہ جگہ پر قاضی کے سامنے کھڑا ہو جائے اس کے بعد خلیفہ نے حضرت علیؑ کی طرف دیکھا اور کہا "یا ابوالحسنؑ اپنے مدعی کے پہلو میں آپ بھی کھڑے ہو جائیں" یہ جملہ سن کر حضرت علیؑ کے چہرے پر برہمی اور ناراضگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر خلیفہ نے کہا: "یا علیؑ! کیا

آپ کو اپنے مدعی کے پہلو میں کھڑا ہونا ناگوار معلوم ہوتا ہے "؟

حضرت علیؑ نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میری برہمی اور ناراضگی کا باعث یہ نہیں تھا کہ میں مدعی کے پہلو میں کھڑا ہونا ناگوار سمجھتا ہوں بلکہ میں اس وجہ سے ناراض ہوا تھا کہ تم نے اسلامی عدالت کے اصول کی مکمل پیروی نہیں کی اور مجھ کو نہایت احترام اور ادب کے ساتھ میری کنیت (یا ابوالحسن) کہہ کر مخاطب کیا لیکن دوسری طرف تم نے مدعی کے نام کے ساتھ کسی قسم کے ادب و احترام کا ثبوت نہیں دیا، دراصل میری برہمی اور ناراضگی کی اصل وجہ یہ تھی۔[1]

---

[1] الامام علی صوت العدالۃ الانسانیۃ، صفحہ ۴۹۔ ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، مطبوعۂ بیروت جلد ۴ صفحہ ۱۸۵

(۲۶)

منیٰ کے میدان میں

حج بیت اللہ کے لئے آئے ہوئے لوگ منیٰ کے میدان میں جمع تھے امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے دوستوں کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے انگور کھا رہے تھے۔

ایک سائل نے آکر سوال کیا، امام نے تھوڑا سا انگور اٹھایا اور چاہا کہ اسے دیدیں۔ سائل نے انگور لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا "مجھے انگور نہیں بلکہ پیسہ دیجئے" امامؑ نے کہا "میرے پاس پیسہ نہیں ہے"، سائل مایوس ہو کر چلا گیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ سائل پشیمان ہوا اور واپس آکر امامؑ سے کہنے لگا "اچھا وہ انگور ہی دیجئے"۔ امامؑ نے جواب دیا "نہیں اب وہ انگور بھی نہیں ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا سائل امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے امداد طلب کی۔ امام نے اس کے لئے ایک خوشۂ انگور اٹھایا اور اسے سائل کو دیدیا سائل نے انگور ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "پروردگار کا ہزار شکر کہ اس نے مجھے

تی روزی پہنچادی" امامؑ نے یہ جملہ سن کر اس سائل سے کہا ذرا ٹھہر جاؤ، اس کے بعد امام نے اپنی دونوں مٹھیوں کو انگور سے بھرا اور لے سائل کو دیدیا۔ اس بار بھی انگور ہاتھ میں لینے کے بعد سائل نے اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا۔

امام نے پھر اس سائل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" ٹھہر جاؤ ابھی آگے نہیں بڑھنا" پھر امامؑ نے قریب کھڑے ہوئے اپنے صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا، "تمہارے پاس کتنا روپیہ ہے؟" صحابی نے تلاش کیا تو تقریباً بیس درہم امامؑ نے صحابی کو حکم دیا کہ یہ سارا روپیہ سائل کی خدمت میں پیش کردو سائل نے روپیہ حاصل کرنے کے بعد تیسری بار اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا "اے خداوند عالم شکر و سپاس صرف تیری ہی ذات کے لئے مخصوص ہے، اے خدا تو ہی نعمتوں کا ادا کرنے والا ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔

امام نے یہ جملہ سننے کے بعد اپنی عبا اتاری اور اسے سائل کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس موقع پر سائل نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے خود امام جعفر صادقؑ کی شان میں چند شکر آمیز کلمات ادا کئے اس کے بعد امام نے سائل کو کچھ نہ دیا اور وہ چلا گیا۔

اس جگہ بیٹھے ہوئے اصحاب اور یارانِ امام نے کہا" ہم لوگوں نے تو یہ سمجھا تھا کہ اگر سائل اسی طرح پروردگارِ عالم کا شکر ادا کرتا چلا گیا تو امام بھی سائل کو دی جانے والی امداد میں ہر بار اضافہ کرتے چلے جائیں گے" لیکن جیسے ہی سائل کے لہجے میں تبدیلی آئی اور اس نے امام کا شکریہ ادا کیا تو امام نے اپنا ہاتھ روک لیا۔[1]

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ حالات امام صادقؑ ص ۱۱۶

۲۷

وزن برداری کا مقابلہ

کچھ مسلمان نوجوان زور آزمائی اور وزن برداری کے مقابلے میں سرگرم تھے۔ ایک وزنی پتھر اس جگہ پڑا ہوا تھا اور سبھی نوجوان اس بھاری پتھر کو اٹھانے میں اپنی قوت اور مردانگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی قوت کے اعتبار سے اس پتھر کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں رسول مقبول اس جگہ پہونچ گئے اور ان نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

"تم لوگ کیا کر رہے ہو۔"

"ہم لوگ زور آزمائی کر رہے ہیں۔ دراصل دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سب سے زیادہ طاقتور کون ہے؟"

"اگر تم لوگ پسند کرو تو میں بتادوں کہ تم میں سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور کون ہے؟"

"جی ہاں، ہم لوگ بڑی خوشی کے ساتھ آمادہ ہیں۔ اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔"

کہ آپ جیسا داور ہمارے درمیان ہونے والے زور آزمائی کے مقابلے کا فیصلہ کرے۔

سبھی لوگ اس بات کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے کہ رسولؐ مقبول کس نوجوان کو سب سے زیادہ طاقتور بتائیں گے؟ کچھ لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ رسول اکرمؐ ان لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہیں گے کہ میری نظر میں تم لوگوں کے درمیان سب سے زیادہ طاقتور یہ ہے۔

تھوڑی دیر بعد رسولؐ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: "سب سے زیادہ طاقتور شخص وہ ہے جس کو کوئی چیز بہت پسند آگئی ہو اور وہ اس چیز کا گرویدہ بھی ہو گیا ہو مگر وہ چیز اس شخص کو حق اور انسانیت کی راہ سے منحرف نہ کر سکے اور وہ چیز اس شخص کو برائی سے آلودہ نہ کر دے۔ یعنی پسندیدہ چیز کا عشق اسے انسانیت سے خارج نہ کر سکے۔ اور اگر وہ شخص کسی چیز سے ناراض ہو گیا ہو اور غصہ کی وجہ سے وہ آگ ببولا ہو رہا ہو پھر بھی اپنے آپ پر وہ پوری طرح قابو رکھتے ہوئے غصہ کی حالت میں بھی سچائی کے علاوہ اور کچھ نہ کہے اور جھوٹ و گالی گلوچ سے اپنی زبان آلودہ نہ کرے۔ اور ایسا شخص اگر صاحب اثر ہو گیا تو بڑی سے بڑی رکاوٹ اور دھمکی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور وہ کسی بھی حال میں حق و انصاف سے تجاوز نہ کرے گا۔"[۱]

---

۱ وسائل، جلد ۲، ص ۴۶۹

۲۸

تازہ مسلمان

دو پڑوسی، جن میں ایک مسلمان اور دوسرا عیسائی تھا، کبھی کبھی آپس میں مذہب اسلام کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ مسلمان ایک عابد و دیندار آدمی تھا۔ گفتگو کے دوران وہ مذہب اسلام کی اتنی تعریف و تمجید کرتا تھا کہ اس کا عیسائی پڑوسی اسلام کی طرف مائل ہوگیا۔ اور کچھ دنوں بعد اس عیسائی نے مذہب اسلام قبول کرلیا۔

رات ڈھل چکی تھی اور سحر کا وقت تھا کہ اس تازہ مسلمان عیسائی کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ متحیّر و پریشان دروازے کے قریب آیا اور پوچھا۔

کون ہے؟

دروازے کے باہر سے ایک آواز بلند ہوئی۔ "میں فلاں شخص ہوں۔" غرض کہ دروازہ کھٹکھٹانے والے نے اپنا تعارف پیش کر دیا۔ یہ وہی مسلمان پڑوسی تھا جس کے ہاتھوں اس عیسائی نے کچھ ہی دنوں قبل اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس تازہ مسلمان عیسائی نے پڑوسی سے دریافت کیا۔

"رات کے وقت تمہیں ایسی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟"

"جلدی وضو کر لو اور کپڑا پہن کر باہر آجاؤ۔ نماز صبح کے لئے مسجد چلنا ہے۔"

اس تازہ مسلمان نے اپنی زندگی میں پہلی بار وضو کیا اور اپنے مسلمان دوست کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی صبح نمودار ہونے میں کافی وقت تھا۔ نافلۂ شب کا موقع تھا۔ ان دونوں ساتھیوں نے کچھ دیر تک نافلہ نمازیں ادا کیں۔ اتنے میں سپیدۂ سحری نمودار ہوا اور نماز صبح کا وقت آگیا۔ ان لوگوں نے نماز صبح ادا کی اور دعا و تعقیب نماز میں مشغول ہو گئے۔ اتنی دیر میں بالکل سویرا ہو گیا۔ چنانچہ وہ نو مسلم عیسائی مسجد سے اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے مسلمان دوست نے اس سے پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو؟"

"میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ صبح کی نماز تو ادا کر لی۔ اب یہاں کیا کام ہے؟"

"تھوڑی دیر اور صبر کرو۔ تعقیبات نماز بھی پڑھ لو۔ اتنی دیر میں سورج نکل آئے گا۔"

"بہت خوب"۔
یہ کہہ کر وہ نومسلم مسجد میں بیٹھ گیا اور اتنی دیر تک ذکر خدا میں مصروف رہا کہ سورج نکل آیا۔ وہ اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چلنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے مسلمان دوست نے قرآن مجید اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:
"فی الحال کچھ دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کرو تاکہ دن چڑھ آئے۔ اور میں سفارش کرتا ہوں آج روزہ کی نیت کر لو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ روزہ کی کیا فضیلتیں ہیں؟"

دھیرے دھیرے ظہر کا وقت آ گیا۔ اس مسلمان دوست نے کہا "تھوڑی دیر اور ٹھہر جا، ظہر کا وقت آنے ہی والا ہے۔ نماز ظہر بھی مسجد میں ادا کر لی جائے۔" اس طرح نماز ظہر بھی ادا ہو گئی۔ اس کے بعد اس مسلمان ساتھی نے کہا: "تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ نماز عصر کی فضیلت کا وقت قریب ہے۔ یہ نماز بھی فضیلت کے وقت ادا کر لی جائے۔" نماز عصر ختم کرنے کے بعد اس نے اپنے نومسلم ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آفتاب غروب ہونے والا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت آ جائے گا۔" اس نومسلم نے نماز مغرب کے بعد گھر کی طرف چلنا چاہا کہ روزہ افطار کرلے۔ اس کے مسلمان دوست نے آواز دیتے ہوئے کہا: "صرف نماز عشا باقی رہ گئی ہے۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد عشا کی فضیلت کا وقت ہو جائے گا۔" غرضکہ اس نومسلم نے عشا کی نماز بھی مسجد میں ادا کی۔ اور اس کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا۔

دوسری رات سحر کے وقت اس نومسلم کے کان میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تو اس نے دریافت کیا۔

"کون ہے ؟"

"میں تیرا پڑوسی اور دوست فلاں ہوں۔ وضو کرلو اور کپڑے پہن کر جلدی باہر آجاؤ۔ ساتھ ساتھ مسجد چل کر وہاں نماز صبح ادا کریں گے۔"

"میں نے کل رات مسجد سے واپسی کے فوراً بعد ہی دین اسلام سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ جاؤ اور کوئی مجھ سے زیادہ بیکار آدمی تلاش کرو جس کے پاس نماز اور عبادت خدا کے علاوہ دنیا کا اور کوئی کام نہ ہو اور وہ اپنا سارا وقت مسجد میں بسر کرے۔ میں غریب اور مفلوک الحال ہوں۔ پھر میرے اوپر میرے اہل وعیال کی ذمہ داری بھی ہے لہٰذا مجھے نماز اور عبادت خدا کے علاوہ اور بھی کام ہیں۔ مجھے اپنے گھر والوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے یہ حکایت بیان کی اور اس کے بعد ارشاد فرمایا۔" اس طرح اس شدت پسند عابد و پرہیزگار مسلمان نے ایک غیر مسلم کو مسلمان تو بنالیا مگر اپنی شدت پسندی کی وجہ سے اس مرد عابد نے اپنے ہی ہاتھوں اس نومسلم کو دائرہ اسلام سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ لہٰذا تم لوگوں کو ہمیشہ اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ لوگ تمہاری شدت پسندی اور افراط کی وجہ سے پریشان نہ ہوجائیں۔ اور لوگوں کی طاقت و توانائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے تبلیغی امور انجام دینا چاہیے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ دین اور اس کی خوبیوں

کی طرف خود بخود مائل ہو جائیں اور ان کو ایسا نہ معلوم ہو کہ یہ چیز ان پر مسلط کی جا رہی ہے۔ اگر انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تو وہ دین سے فرار اختیار کریں گے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ شدت پسندی اور سخت گیری اموی حکمرانوں کی روش تھی اور اس کے برعکس ہمارا طرز اور انداز تبلیغ حسن اخلاق، نرمی، محبت اور باہمی خلوص پر مبنی رہا ہے اور ہم لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے کہ اپنے اچھے اور خالص اسلامی اخلاق کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر فتح و کامیابی حاصل کر لی جائے۔[۱]

---

[۱] وسائل جلد ۲ ص ۴۹۴، باب استحباب الرفق علی المومنین حدیث ۳ و حدیث ۹

(۲۹)

خلیفہ کا دسترخوان

شریک بن عبداللہ نخعی دوسری صدی ہجری کے مشہور و معروف علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ علم و تقویٰ کے میدان میں عدیم المثال شخصیت کے حامل تھے، عباسی خلیفہ مہدی بن منصور کی دلی خواہش تھی کہ قاضی کا منصب ان کے سپرد کر دے، لیکن شریک بن عبداللہ اپنے آپکو ظلم و ناانصافی کی بنیاد پر قائم حکومت سے دور رکھنے کے لیے اس عہدے کو قطعی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے، خلیفہ کی یہ بھی خواہش تھی کہ شریک کو اپنے لڑکوں کا خصوصی معلم مقرر کر دے، تاکہ اس کے لڑکے شریک جیسے مایۂ ناز عالم کی شاگردی میں علم حدیث میں مہارت حاصل کریں، لیکن شریک جیسا متقی اور پرہیزگار عالم اس عہدے کو بھی قطعی قبول کرنا نہیں چاہتا تھا، دراصل وہ اپنی آزاد اور فقیرانہ زندگی سے پوری طرح مطمئن تھے۔

ایک دن خلیفہ نے انھیں دربار خلافت میں طلب کیا اور کہا: میں تمہارے سامنے تین اہم چیزیں پیش کرتا ہوں تمہیں چاہئے کہ ان تین چیزوں

میں سے کوئی ایک چیز منتخب کرلو، یا قاضی کا منصب قبول کرلو یا میرے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھال لو اور یا تو آج تم میرے ساتھ دوپہر کا کھانا میرے دسترخوان پر نوش کرو۔"

شریک نے کچھ دیر تک غور و فکر کیا اور بولے اس اجبار و اضطرار کے ماحول میں ان تین چیزوں میں سے میرے لیے تیسری چیز زیادہ آسان ہے۔

چنانچہ خلیفہ نے اپنے مخصوص باورچی کو حکم دیا کہ آج شریک جیسے مایہ ناز عالم کے لیے عمدہ اور لذیذ ترین غذا تیار کرو، خلیفہ کا حکم ملتے ہی شاہی خدمت گذاروں نے انواع و اقسام کی غذاؤں سے دسترخوان سجایا۔

شریک نے اس سے قبل ایسی غذا دیکھی بھی نہیں تھی، چنانچہ رنگارنگ غذاؤں کو دیکھ کر ان کی بھوک جاگ اٹھی اور انہوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ان کے کھانے کا انداز دیکھ کر خان سامہ نے خلیفہ کے کان میں آہستہ سے کہا: "خدا کی قسم اب یہ شخص ہمارے چنگل سے چھٹکارا نہ پاسکے گا۔"

ابھی زیادہ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ شریک نے خلیفہ کے لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اور قاضی کا عہدہ بھی قبول کرلیا، اور بیت المال سے ان کی تنخواہ بھی مقرر کردی گئی۔

ایک دن تنخواہ کے لین دین میں خزانچی اور شریک کے درمیان کچھ جھڑپ ہوگئی تو خزانچی نے ان سے کہا: "تم نے ہمارے ہاتھ گیہوں

نہیں فروخت کیا ہے جو حساب کتاب میں اس قدر نخرہ دکھا رہے ہو۔"

شریک نے جواب دیا "شاید تجھے نہیں معلوم کہ میں نے گیہوں سے بہتر اور قیمتی چیز فروخت کی ہے، میں نے تو حکومت کے ہاتھوں اپنا دین فروخت کر دیا ہے۔"[1]

---

[1] مروج الذہب مسعودی، جلد ۲ حالات مہدی عباسی۔

۳۰

پڑوسی کی شکایت

ایک شخص رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے پڑوسی کی شکایت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میرا پڑوسی مجھے اتنا پریشان کرتا ہے کہ میرا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔

رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا "صبر کر اور اپنے پڑوسی کے خلاف شور وغل مت اٹھا بلکہ اپنی روش میں کچھ تبدیلی پیدا کر لے۔" کچھ دنوں بعد وہ شخص رسول اکرمؐ کے پاس دوبارہ حاضر ہوا اور اپنے پڑوسی کی شکایت کی اس بار بھی رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا "صبر کر" کچھ دنوں بعد وہ شخص تیسری بار خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، یا رسول اللہ میرا یہ پڑوسی اپنی بری حرکتوں سے باز نہیں آتا اور پہلے کی طرح مجھے اور میرے گھر والوں کو بری طرح سے پریشان کئے ہوئے ہے۔"

اس بار رسول اکرمؐ نے اس سے کہا "جمعہ کا دن آ گیا ہے تو

جا اور اپنے گھر کا سارا سامان باہر نکال کر سرِ راہ ایسی جگہ رکھ دے جہاں لوگ آتے جاتے اسے دیکھ سکیں، تیرے سامان کو راستے میں پڑا ہوا دیکھ کر لوگ تجھ سے دریافت کریں گے کہ آخر تو نے اپنا سارا سامان گھر سے باہر نکال کر کیوں رکھ دیا ہے؟ جب لوگ اس طرح کا سوال کریں تو ان سے کہنا کہ میں اپنے پڑوسی کی بداخلاقی کی وجہ سے بیحد پریشان ہوں، اس طرح تو اپنی شکایت عوام کے کانوں تک پہنچا دے۔

شکایت کرنے والے نے رسولِ مقبولؐ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بالکل ویسا ہی کام انجام دیا، موذی ہمسایہ یہ خیال کرتا تھا کہ پیغمبرؐ اسلام ہمیشہ لوگوں کو صبر اور بردباری کا حکم دیتے ہیں، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جب دفعِ ظلم اور حقوق کے دفاع کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اسلام کی نظر میں متجاوز کا کوئی احترام باقی نہیں رہ جاتا لہٰذا جیسے ہی اسے اس بات کی اطلاع ملی کہ اس کے پڑوسی نے اس کی زیادتی سے تنگ آکر معاملے کو عوام کی عدالت میں پیش کر دیا ہے تو وہ بری طرح گھبرا گیا اور اس آدمی سے التماس کرنے لگا کہ اپنا سامان راستے سے اٹھا کر گھر واپس لے چل صرف یہی نہیں بلکہ اس نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ آئندہ اپنے پڑوسی کو بھی پریشان نہ کرے گا اور اس قسم کی شکایت کا موقع پھر نہ آنے دیگا۔[۱]

---

[۱] اصول کافی جلد ۲ باب حق الجوار ص ۶۶۸

(۳۱)

درختِ خرما

ایک انصاری کے باغ میں سمرۃ بن جندب نے خرمے کا ایک درخت لگا رکھا تھا۔ اس انصاری کا رہائشی مکان اسی باغ میں تھا جس میں اس کے بیوی بچے رہا کرتے تھے۔ سمرہ کبھی کبھی پیڑ کی دیکھ بھال کے لیے یا خرما چینی کی غرض سے اس باغ میں آیا کرتا تھا۔ اور اسلامی قانون کے مطابق سمرہ کو اس انصاری کے گھر میں آمد و رفت کا حق حاصل تھا تاکہ وہ اپنے پیڑ کی نگہبانی کر سکے۔

سمرہ اپنے پیڑ کی نگہبانی کے لئے اس انصاری کے گھر میں انتہائی لاپرواہی کے ساتھ دھڑانہ گھس جایا کرتا تھا۔ اور گھر میں داخل ہوتے وقت اس کی نگاہ گھر کی دوسری چیزوں پر بھی پڑا کرتی تھی۔

ایک بار گھر کے مالک نے سمرہ سے درخواست کی کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اسے لاپرواہی سے کام نہ لینا چاہیے۔ اور مناسب تو یہ ہے

کہ وہ آواز دیکر گھر کے اندر داخل ہوا کرے۔ سمرہ نے اس مرد انصاری کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ گھر کا مالک مجبوراً رسول مقبولؐ کی خدمت میں آیا اور اپنی شکایت بیان کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ شخص انتہائی لاپرواہی کے ساتھ میرے گھر میں درانہ داخل ہو جایا کرتا ہے۔ آپ اس سے کہدیں کہ گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے اپنے آمد کی اطلاع دے دیا کرے۔ تاکہ میرے گھر والے اس کی نظروں سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا کریں۔"

رسول مقبولؐ نے سمرہ کو طلب کیا اور اس سے ارشاد فرمایا "فلاں شخص کو تجھ سے یہ شکایت ہے کہ تو بغیر اطلاع دیئے ہوئے اس کے گھر میں گھس جایا کرتا ہے اور اس کے گھر والوں کو تو ایسی حالت میں دیکھ لیا کرتا ہے جو اس کو قطعی ناگوار ہے۔ لہذا آئندہ اس شخص کے مکان میں داخل ہونے سے پہلے آواز لگا کر اپنی آمد سے ان لوگوں کو مطلع کر دیا کر۔ کسی کے گھر میں بغیر اس کی اجازت حاصل کئے ہوئے نہ داخل ہونا چاہیے۔" سمرہ حضرت رسول خدا کی اس بات سے راضی نہ ہوا۔

رسول مقبولؐ نے کہا۔ اچھا اگر میری یہ بات قابل قبول نہیں ہے تو پھر تو اپنے درخت کو فروخت کر دے۔ وہ شخص اس بات پر بھی راضی نہ ہوا۔ رسول اکرمؐ نے اس درخت کی قیمت کچھ اور بڑھا دی پھر بھی وہ اپنی ضد پر ڈٹا رہا اور کسی بھی قیمت پر اس درخت کو بیچنے کے لئے قطعی آمادہ نہ ہوا۔ رسول مقبول نے ارشاد فرمایا۔ "اگر تو یہ کام کرلے تو

بہشت میں بھی تیرے لئے ایک پھلدار درخت حاصل ہو جائے گا"۔ ان تمام باتوں کو سننے کے بعد بھی وہ شخص درخت فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور اپنی اس ضد پر ڈٹا رہا کہ میں اس درخت کو فروخت کروں گا اور نہ ہی میں اس باغ میں داخل ہوتے وقت باغ کے مالک سے پہلے اجازت حاصل کروں گا۔

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول مقبول نے ارشاد فرمایا۔ تو ایک نقصان پسند اور سخت گیر آدمی ہے اور اسلام میں کسی کو پریشان کرنے یا نقصان پہونچانے کا قطعی حق نہیں ہے[1]۔ اس کے بعد رسول اکرمؐ نے اس انصاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ اور خرمے کے درخت کو باہر نکال کر پھینک دو۔

چنانچہ یہ لوگ وہاں پہونچے اور لازم ہدایات کے مطابق سارا کام انجام دیا۔ اس کے بعد رسول مقبولؐ نے سمرہ سے کہا جاؤ کھیت موجود ہے تمہارا جہاں دل چاہے وہاں اس درخت کا استعمال کرو۔

---

[1] "فانک رجل مضار ولا ضرر ولا ضرار"

[2] وسائل، جلد ۳، کتاب الشفعۃ باب "عدم جواز الاضرار بالمسلم" صفحہ ۳۲۹ حدیث ۱ و ۲ و ۳

maablib.org

(۳۲)

ام سلمہ کے گھر میں

اس رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ام سلمہ کے گھر میں تھے۔ تقریباً آدھی رات گزر چکی تھی کہ ام سلمہ کی آنکھ کھل گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ رسول مقبولؐ اپنے بستر پر موجود نہیں ہیں۔ انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں وہ سوچنے لگیں کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ چنانچہ عورتوں کی مخصوص عادت اور حسادت زنانہ کے تحت انھیں یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ آؤ پتہ لگائیں کہ رسول خداؐ کہاں چلے گئے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھیں اور ان کی تلاش کرنے لگیں۔ انہوں نے دیکھا کہ رسولؐ مقبولؐ گھر کے تاریک گوشے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ آسمان کی طرف بلند ہیں اور گریہ وزاری کے عالم میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یوں فریاد کر رہے ہیں۔

"اے پروردگار عالم! تو نے جو عمدہ نعمتیں اور اچھی چیزیں مجھے عطا کی ہیں انھیں مجھ سے واپس نہ لے۔ اے خدا! مجھے دشمنوں اور حاسدوں کی شماتت سے محفوظ رکھ۔ اے مالک کائنات! تو نے مجھے جن برائیوں سے

دور رکھا ہے ان کی طرف کبھی نہ لے جا۔ اور اے دوجہاں کے مالک! ایک!
ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے ناراض نہ ہونا۔"

رسول مقبولؐ کی زبان سے یہ جملے سن کر ام سلمہ کانپنے لگیں۔ ان کے پیروں میں اتنی طاقت باقی نہ رہ گئی کہ کچھ دیر اور کھڑی رہ سکیں چنانچہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ گئیں اور ان پر بے تحاشہ گریہ طاری ہو گیا ام سلمہ کی گریہ وزاری کی آواز بڑھتی چلی گئی۔ آخرکار رسول اکرمؐ ان کے پاس تشریف لائے ان سے دریافت کیا۔

"ام سلمہ! کیوں رو رہی ہو۔ آخر اس گریہ وزاری کا سبب کیا ہے؟"

"کیوں نہ گریہ کروں۔ اللہ کے نزدیک آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے، آپ اس کی ذات سے قریب ہیں اور عہدۂ رسالت پر بھی فائض ہیں پھر بھی خوف پروردگار سے آپکا یہ عالم ہے کہ آپ اس سے یہ فریاد کر رہے ہیں کہ ایک پل کے لیے بھی وہ آپ سے غافل نہ ہو۔ پس آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ ہم جیسے لوگوں کی حالت کیا ہوگی۔"

"اے ام سلمہ! میں کیسے پریشان نہ ہوں اور کیسے مطمئن رہوں۔ یونس پیغمبر کو ایک لمحے کے لیے ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا تو ان کے سر جو مصیبت آنی تھی وہ آ گئی۔"[1]

---

[1] بحار جلد ٦ "باب مکارم اخلاقہ و سیرہ و سننہ"۔

(۲۳)

کالا بازار

کثرت عیال کی وجہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی ضروریات زندگی میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ خانگی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں تجارت اور دیگر ذریعہ معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ انہوں نے ہزار دینار کی رقم اپنے غلام مصادف کے حوالے کرتے ہوئے اس سے کہا: "یہ ہزار دینار لو اور تجارت کی غرض سے مصر کے سفر کیلئے آمادہ ہو جاؤ۔"

مصادف نے اس رقم سے مصر کے بازار میں زیادہ بکنے والی چیزیں خریدیں اور تاجروں کے قافلے کے ساتھ مصر کی جانب روانہ ہو گیا جیسے ہی یہ لوگ مصر کے قریب پہنچے ان کی ملاقات تاجروں کے ایک دوسرے قافلے سے ہوئی جو مصر سے واپس آ رہا تھا۔ دونوں قافلے کے تاجروں نے ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی اور گفتگو کے دوران انھیں یہ معلوم ہوا کہ جو تجارتی سامان ان کے پاس موجود

ہے وہ مصر کی بازار میں بالکل نایاب ہے۔ دولتمند تاجر یہ خبر سنتے ہی اپنی خوش قسمتی پر فخر کرنے لگے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ان کا تجارتی مال عام لوگوں کی ضرورت میں کام آنے والا ہے۔ لہذا بازار میں اس مال کی کمی کی وجہ سے لوگ ان کے سامان کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس طرح انھیں اپنے مال کی منہ مانگی قیمت مل جائیگی۔

چنانچہ سبھی تاجروں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ سو فیصد منافع سے کم میں اپنا مال نہ فروخت کریں گے۔ جیسے ہی یہ لوگ سرزمین مصر میں داخل ہوئے انھیں فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ راہ میں ملنے والی اطلاع بالکل صحیح ہے۔ باہمی عہد و پیمان کی رو سے ان تاجروں نے کالا بازاری کا ماحول پیدا کر دیا اور کسی نے بھی دوگنا قیمت سے کم میں اپنا مال فروخت نہ کیا۔ چونکہ بازار میں اس مال کی کمی تھی اور ضرورت زیادہ لہذا کچھ ہی دنوں میں ان کا سارا مال دوگنا قیمت پر بھی فروخت ہوگیا۔

دیگر تاجروں کی طرح مصادف بھی ہزار دینار خالص منافع لئے ہوئے مدینہ واپس آگیا۔ وہ خوشی خوشی امام جعفر صادق ؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہزار ہزار دینار کی دو تھیلیاں ان کے سامنے رکھدیں امام نے مصادف سے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" مصادف نے جواب دیتے ہوئے کہا: "ان میں سے ایک وہ سرمایہ ہے جو آپ نے میرے سپرد کیا تھا اور دوسری تھیلی میں منافع کی رقم ہے جو اصل سرمایہ کے برابر ہے۔"

امام نے کہا: "مصادف! منافع تو بہت زیادہ ہے۔ ذرا

بتاؤ تو کہ اتنا زیادہ منافع تم لوگوں کو کیسے حاصل ہو گیا ؟"

"معاملہ یہ ہے کہ مصر کے قریب پہونچنے کے بعد ہم لوگوں کو اطلاع ملی کہ بازار مصر میں اس مال کی شدید کمی ہے جو ہم لوگوں کے پاس ہے۔ لہذا ہم لوگوں نے آپس میں یہ عہد کر لیا کہ سو فیصد منافع سے کم میں اپنا مال نہ فروخت کریں گے۔ پھر ہم لوگوں نے ایسا ہی کیا اور سو فیصد فائدہ پر اپنا مال فروخت کر کے واپس چلے آئے۔"

"سبحان اللہ! تم لوگوں نے ایسی حرکت کی ہے! تم لوگوں نے یہ عہد کیا کہ مسلمانوں کے درمیان کالا بازاری کا ماحول پیدا کر دوگے اور تم لوگوں نے باہم یہ قسم اٹھائی کہ سو فیصدی منافع سے کم قیمت پر اپنا مال نہیں فروخت کروگے۔ نہیں، میں ایسی تجارت اور ایسا منافع ہرگز پسند نہیں کرتا ہوں۔"

اس کے بعد امام نے ایک تھیلی اٹھائی اور کہا "یہ میری پونجی ہے۔" دوسری تھیلی اسی جگہ پڑی رہنے دی اور کہا "اس دوسری تھیلی سے جسمیں سو فیصد منافع کی رقم ہے، میرا قطعی اور کوئی سروکار نہیں ہے۔"

پھر امام جعفر صادق نے مصادف کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اے مصادف! حلال روزی کے مقابلے میں تلوار چلانا آسان ہے یعنی تلوار چلانا آسان ہے مگر حلال روزی حاصل کرنا آسان نہیں ہے[۱]۔"

---

[۱] "یا مصادف مجالدۃ السیوف اھون من طلب الحلال"۔

بحار الانوار، جلد ۱۱، ص ۱۲۱۔

(۲۴)

قافلے سے بچھڑا ہوا

رات کی تاریکی میں ایک نوجوان کی درد بھری آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے منہ سے بار بار اماں اماں کی فریاد نکل رہی تھی گویا وہ یہ کہہ رہا تھا کہ کوئی مجھے میری ماں کے پاس پہونچا دے۔ دراصل اس کا بوڑھا اور لاغر اونٹ قافلے کے پیچھے رہ گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر تک چلنے کے بعد اونٹ بالکل تھک کر چور ہو گیا اور ہر طرح کی کوشش کے باوجود وہ آگے نہ بڑھا۔ یہ دیکھ کر وہ نوجوان پریشان ہو گیا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ آخرکار وہ اونٹ کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر نالہ و فریاد کرنے لگا۔ اسی اثنا میں رسول مقبولؐ نے، جو ہمیشہ قافلے کے پیچھے چلا کرتے تھے تاکہ اگر کوئی بوڑھا یا کمزور آدمی قافلے سے بچھڑ جائے تو وہ تنہا اور بے سہارا نہ رہ جائے دور سے اس نوجوان کے نالہ و فریاد کی آواز سن لی۔ چنانچہ جب نوجوان کے قریب پہونچ گئے تو اس سے پوچھا۔

"تو کون ہے۔؟"

میں جابر ہوں۔"

"آخر اس قدر خوفزدہ اور پریشان کیوں ہو؟"

"یا رسول اللہ! میرا اونٹ تھکاوٹ اور کمزوری کی وجہ سے زمین سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور قافلہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔"

"تیرے پاس عصا ہے کہ نہیں؟"

"جی ہاں۔ ہے۔"

"لا مجھے دیدے"

اس کے بعد رسول اکرمؐ نے عصا کے سہارے سے اس اونٹ کو حرکت دی۔ اونٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رسول مقبولؐ نے اسے پھر بٹھا دیا اور اس کی رکاب اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے جابر سے کہا۔

"سوار ہو جاؤ"

جابر اپنے اونٹ پر سوار ہو کر رسول مقبولؐ کے ہمراہ چل پڑے اس بار جابر کا اونٹ قدرے تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ پیغمبر اسلام راستے میں نہایت محبت آمیز الفاظ میں جابر سے گفتگو کرتے رہے۔ جابر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیغمبر اسلام نے تقریباً ۲۵ مرتبہ پروردگار سے ان کی بخشش کی دعا مانگی۔

راستے میں پیغمبر اسلام نے جابر ابن عبداللہ سے سوال کیا۔

"تمہارے کتنے بہن بھائی ہیں۔؟"

"یارسول اللہ! میری سات بہنیں ہیں اور کوئی بھائی نہیں بلکہ میں اکیلا ہوں"

"تم نے اپنے باپ کا سارا قرض ادا کر دیا یا کچھ باقی ہے؟"

"نہیں ابھی کچھ لوگوں کا مطالبہ باقی ہے۔"

"پس مدینہ واپس آنے کے بعد تم ان لوگوں سے ادائیگی قرض کے بارے میں بات کر لینا اور جب خرما چینی کا موقع آجائے تو مجھے اطلاع کر دینا۔"

"بہت اچھا۔"

"تم نے شادی کر لی؟"

"جی ہاں۔"

"کس لڑکی سے شادی کی ہے؟"

"میں نے فلاں بنت فلاں کے ساتھ شادی کی ہے۔ وہ مدینہ کی بیوہ خواتین میں سے ایک ہے۔"

"آخر تم نے کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہیں کی؟ تم جیسے کم سن جوان کیلئے دوشیزہ زیادہ مناسب ہوتی۔"

"یارسول اللہ! میں چند جوان اور ناتجربہ کار لڑکیوں کا بھائی ہوں۔ اس لئے جوان اور بے تجربہ خاتون سے شادی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور مصلحت وقت کا احساس کرتے ہوئے ایک عقلمند اور تجربہ کار بیوہ خاتون سے شادی کرلی"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ یہ اونٹ کتنے روپیے میں خریدا ہے؟"

"پانچ وقیہ طلا میں۔"

"میرے پاس بھی اتنی ہی پونجی ہے۔ مدینہ آکر تم اس اونٹ کی قیمت مجھ سے

لے لینا۔"

غرضکہ سفر ختم ہوا۔ اور کچھ دنوں بعد سبھی لوگ مدینہ واپس آ گئے۔ جابر اپنا اونٹ لیئے ہوئے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اسے ان کی تحویل میں دیدیں۔ رسول مقبولؐ نے جابر کو دیکھتے ہی بلال سے کہا۔ "پانچ وقیہ طلا جابر کو دیدو۔ یہ ان کے اونٹ کی قیمت ہے۔ اور تین وقیہ طلا انہیں اور دیدو تاکہ اپنے باپ عبداللہ کا قرض چکا دیں۔ اس کے ساتھ یہ اونٹ بھی انہیں واپس کر دیا کہ اپنے پاس ہی رکھے رہیں۔

اس کے بعد رسول اکرمؐ نے جابر سے پوچھا: "قرض طلب کرنے والوں سے تمہاری کوئی بات چیت ہوئی کہ نہیں؟"

"نہیں۔ یا رسول اللہؐ! ابھی ان لوگوں سے کوئی گفتگو نہیں ہو سکی۔"

"کیا تمہارے باپ عبداللہ نے جو چیزیں میراث میں چھوڑی ہیں وہ ان کا قرض ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟"

"نہیں۔ میراث کی چیزیں ان کا قرض ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔"

"پس خرما چینی کے موقع پر مجھے بتانا۔"

کچھ ہی دنوں بعد خرما چینی کی فصل آ گئی اور جابر نے رسول اکرمؐ کو اطلاع دی۔ وہ تشریف لائے اور عبداللہ کے ذمے جن لوگوں کا قرض باقی تھا وہ سب ادا کر دیا اور کچھ رقم جابر کے گھر والوں کی پرورش کے لیے ان کے حوالے کر دی۔[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۴ باب مکارم اخلاق و سیرہ و سنتہ"

۳۵

جوتے کا فیتہ

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے دوستوں کے ساتھ ایک عزیز کی تعزیت کے لئے اس کے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کے جوتے کا فیتہ ٹوٹ گیا اور امام کو راستہ چلنے میں دشواری ہونے لگی۔ انھوں نے جوتا اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور ننگے پیر راستہ طے کرنے لگے۔

یہ دیکھتے ہی امامؑ کے قریب ترین صحابی ابن ابی یعفور نے فوراً اپنا جوتا اتارا اور اس کا فیتہ نکال کر امام کی خدمت میں پیش کرنا چاہا تاکہ امام جوتا پہن کر چلیں اور وہ خود ننگے پیر راستہ طے کریں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام عبداللہ ابن ابی یعفور کی اس عقیدتمندانہ حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور انکی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور کسی قیمت پر اس بات کے لئے آمادہ نہ ہوئے کہ ان کا فیتہ لے کر اپنے جوتے میں لگائیں۔ عبداللہ کے شدید اصرار پر امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"اگر کسی شخص پر کوئی مصیبت آپڑی ہے تو اس مصیبت اور پریشانی کو جھیلنے کے لئے وہی شخص سب سے زیادہ بہتر ہوا کرتا ہے جس پر وہ مصیبت آئی ہو۔ یہ قطعی مناسب نہیں ہے کہ اگر کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو دوسرا آدمی تکلیف برداشت کرے۔"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۱۱۷

(۳۶)

ہشام اور فرزدق

دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اموی حکومت بڑے عروج پر تھی۔ ہشام بن عبدالملک ولی عہد حکومت نے خانۂ کعبہ کے طواف کے بعد ہر چند کوشش کی کہ حجر اسود کو بوسہ دینے میں کامیاب ہو جائے مگر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے وہ اپنی یہ خواہش پوری نہ کرسکا اور حجر اسود کے قریب پہونچنے میں ناکامیاب رہ گیا۔ سبھی لوگ احرام باندھے ہوئے تھے سب کی زبان پر ذکر خدا تھا اور سبھی حجاج ایک ہی قسم کے اعمال میں مصروف تھے۔ غرضکہ سبھی لوگ پاک و پاکیزہ احساس و خیالات میں اس طرح غرق تھے کہ کسی کو ہشام کی دنیادی شخصیت اور سماجی وقار کے بارے میں غور و فکر کی فرصت نہ تھی۔ ہشام کے ساتھ آئے ہوئے لوگ البتہ اس کام میں پوری طرح سرگرم تھے کہ ولی عہد سلطنت کی ذاتی حشمت برقرار رہ جائے۔ ان لوگوں کی نظر میں اعمال و ارکان حج کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ انھیں پروردگار کی خوشنودی کے بجائے ولی عہد کی خوشی کا زیادہ خیال تھا۔

غرضکہ ہشام نے خود کو حجر اسود تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ آداب حج کے مطابق وہ اپنے ہاتھ اس مقدس پتھر سے مس کر لے مگر امڈتی ہوئی بھیڑ کی وجہ سے اس کی ہر کوشش بے کار چلی گئی اور مجبوراً وہ واپس لوٹ آیا۔ اس کے خوشامدی خدمت گزاروں نے ایک اونچی جگہ پر ایک کرسی رکھ دی تھی۔ چنانچہ واپس لوٹنے کے بعد ہشام اس کرسی پر بیٹھ کر حج کا تماشہ دیکھنے لگا۔ ہشام سے ساتھ آئے ہوئے لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے اور ولی عہد حکومت کے ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی عاشقان خانۂ خدا کی عقیدت اور ان کے ذوق و شوق کا منظر دیکھنے میں پوری طرح مصروف ہو گئے۔

اسی اثنا میں ایک ایسا خوبصورت شخص نمودار ہوا جس کے چہرے سے اس کی پرہیزگاری کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے جسم پر بھی دیگر حاجیوں کی طرح ایک سادہ لباس یعنی احرام کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے چہرے سے عبادت اور بندگی پروردگار کی جھلک مل رہی تھی۔ پہلے اس شخص نے خانہ کعبہ کا طواف کیا پھر نہایت سکون و اطمینان قلب کے ساتھ یہ شخص حجر اسود کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ شخص حجر اسود کی طرف بڑھا، مجمع کائی کی طرح پھٹتا چلا گیا اور وہ شخص حجر اسود کے قریب پہونچ گیا۔ ولی عہد کے ہمراہ دارالحکومت شام سے آئے ہوئے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے دیکھا تھا کہ ولی عہد تمام دنیاوی شان و شوکت اور جان توڑ کوشش کے باوجود حجر اسود تک نہ پہونچ سکا تھا۔ چنانچہ یہ منظر دیکھ کر

ان کی حیرانی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ان میں سے ایک شخص نے ہشام سے دریافت کیا۔
"یہ کون ہے ؟"

ہشام کو بخوبی علم تھا کہ یہ علی ابن الحسین زین العابدینؑ ہیں۔ لیکن اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس شخص کو نہیں پہچانتا۔"

ایسے موقع پر ہشام کے خوف کی وجہ سے کس میں اتنی ہمت تھی کہ امام کے تعارف میں اپنی زبان کھولتا ؟ ہر ایک کو یہ معلوم تھا کہ ہشام کی تلوار سے خون ٹپکتا رہتا ہے اور اس وقت زبان کھولنے کا مطلب اس کی تلوار کو گلے لگانا ہے۔ لیکن اس دور کے مشہور اور ممتاز شاعر عبد ہمام ابن غالب المعروف بہ فرزدق کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور بے ساختہ بول پڑا "لیکن میں اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" یہ کہنے کے بعد بھی فرزدق کو تسکین نہ ہوئی چنانچہ وہ قریب کی بلندی پر کھڑا ہو گیا اور امام کی مدح میں فی البدیہہ قصیدہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنی مخصوص آواز میں پڑھنے لگا۔ فرزدق کا یہ قصیدہ عربی ادبیات میں شاہکاری حیثیت کا حامل ہے۔ قصیدہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں جذبات کا زبردست سیلاب امنڈ رہا تھا اور اس نے اپنے روحانی جذبات کو اشعار کے قالب میں جس طرح پیش کیا ہے اس کے لئے انتہائی پرسکون ماحول کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل ہی برعکس تھی۔ فرزدق کی نگاہوں کے سامنے ہشام کی ننگی تلوار چمک رہی تھی اور وہ فی البدیہہ اشعار نظم کرتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے اشعار میں فرزدق امام زین العابدین کا تعارف

پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ وہ شخص ہے جس کو سرزمین بطحا کے تمام سنگریزے بخوبی پہچانتے ہیں۔ یہ کعبہ اس شخص کو پہچانتا ہے۔ حرم کی مقدس سرزمین اور حرم مقدس کے باہر کی خاک بھی اس شخص سے بخوبی واقف ہے۔"

"یہ بہترین بندگان خدا کا فرزند ہے۔ یہ انتہائی متقی و پرہیزگار، پاک و پاکیزہ اور مشہور و معروف شخصیت ہے۔"

ہشام ابن عبد الملک کو مخاطب کرتے ہوئے فرزدق امام کی یوں مدح سرائی کرتا ہے۔

"تو یہ کہتا ہے کہ اس شخص کو نہیں پہچانتا۔ مگر تیرا یہ کہنا اس شخص کے لیے قطعی نقصان دہ نہیں ہے۔ یعنی تیرے یہ کہہ دینے سے اس بلند مرتبہ شخص کی عظمت و بزرگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بفرض محال اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تنہا تو اس شخص کو نہیں پہچانتا تو کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ سارا عرب و عجم اس شخص سے بخوبی واقف ہے۔"[1]

---

[1] هذا الذی تعرف البطحاء وطأته

والبیت یعرفه والحل والحرم

هذا ابن خیر عباد الله کلهم

هذا التقی النقی الطاهر العلم

ولیس قولک من هذا بضائره

العرب تعرف من انکرت والعجم

فرزدق کا یہ قصیدہ سن کر ہشام غیض و غضب سے آگ بگولا ہو گیا اور فوراً حکم صادر کر دیا کہ فرزدق کو بیت المال سے جو وظیفہ دیا جاتا ہے اسے بالکل بند کر دیا جائے۔ چنانچہ اموی حکومت سے ملنے والا وظیفہ بند کر دیا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ فرزدق کو مکہ و مدینہ کے درمیان "عسفان" میں مقید کر دیا گیا۔ فرزدق کو یہ سزائیں اس لئے دی گئی تھیں کہ اس نے دلیرانہ انداز میں اپنے عقیدہ کا اظہار کر دیا تھا۔ لیکن فرزدق کی نظر میں ان دنیاوی مصائب اور پریشانیوں میں ڈال دینا فرزدق کی نظر میں ایک انتہائی معمولی سی بات تھی۔ اور اس کی ہمت و شجاعت کا یہ عالم تھا کہ قید خانہ کی زندگی میں بھی وہ ہشام کی حرکتوں پر بھرپور تنقید کرتے ہوئے ہجویہ قصائد نظم کرنے سے باز نہیں آیا۔

جب حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ فرزدق کو حکومت کی طرف سے ملنے والا وظیفہ بند کر دیا گیا ہے اور وہ قید خانہ کی زندگی بسر کر رہا ہے تو آپ نے اس کے لیے کچھ روپیہ قید خانہ بھیجا مگر فرزدق جیسے غیرت دار شاعر نے وہ رقم قبول نہیں کی اور کہا۔ "میں نے وہ قصیدہ اپنے عقیدہ و ایمان کی ترجمانی اور صرف خوشنودی پروردگار کے لئے نظم کیا تھا لہٰذا میں اس کے عوض میں کوئی رقم قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام نے دوبارہ وہ رقم فرزدق کے پاس اس پیغام کے ساتھ ارسال کر دی۔ "پروردگار عالم تیری نیت اور تیرے ارادے سے بخوبی واقف ہے۔ اور تیری نیت و ارادے کے مطابق وہ تجھے عمدہ جزا بھی عطا کرے گا۔ اگر تو نے یہ مالی امداد قبول کر لی تو

اس کی وجہ سے پروردگار کی جانب سے ملنے والے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ امام نے فرزدق کے پاس یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس رقم کو ضرور قبول کرلے چنانچہ فرزدق نے امام کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ رقم قبول کرلی۔[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۳۴

(۳۷)

بزنطی

احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی کا شمار اس دور کے جلیل القدر علماء و دانشمندوں میں ہوتا تھا۔ ان کے اور امام رضا علیہ السلام کے درمیان بہت دنوں تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ بزنطی نے امامؑ سے بے شمار سوالات کئے اور امام نے ان کے ہر سوال کا اتنا منطقی جواب دیا کہ آخر کار وہ حضرت رضا علیہ السلام کی امامت کا معتقد ہوگیا۔ ایک روز اس نے امام سے درخواست کی "حکومت کی جانب سے میری آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں ہے اور مجھے ہر جگہ آنے جانے کی پوری آزادی ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ میں کسی روز آپکے گھر آؤں اور کچھ دیر تک آپکے علم سے استفادہ کروں۔"

چنانچہ ایک روز شام کے وقت امام رضاؑ نے اپنی مخصوص سواری بھیجی اور بزنطی کو مہمان بلا بھیجا۔ علمی مباحث اور سوال و جواب میں آدھی رات گزر گئی۔ بزنطی مسلسل سوال کرتے رہے اور امام عالمانہ انداز میں ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ بزنطی اس خیال سے بے پناہ خوش تھا کہ

آج امامؑ نے اسے اپنا مہمان بلایا ہے اور اسے یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ وہ ذاتی طور پر امامؑ کے علم سے استفادہ کر رہا ہے۔

رات گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ سونے کا وقت آگیا۔ امامؑ نے خدمت گار کو بلایا اور کہا "جس بستر پر میں سوتا ہوں اسے بزنطی کے لئے بچھا دو تاکہ وہ آرام کریں۔"

یہ پرخلوص محبت بزنطی پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوئی اور وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گئے۔ اور دل ہی دل میں یہ کہنے لگے کہ "آج دنیا میں مجھ سے زیادہ سعادت مند اور خوش قسمت کوئی نہیں ہے۔ امامؑ نے میرے لئے اپنی مخصوص سواری بھیجی کہ میں ان کے یہاں آسکوں۔ یہ میں ہوں کہ امامؑ نے آدھی رات تک صرف مجھ سے گفتگو کی اور میرے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ اور یہ میں ہوں کہ جب میرے آرام کا وقت آگیا تو امامؑ نے حکم دیا کہ ان کا ذاتی بستر میرے لئے بچھا دیا جائے۔ پس دنیا میں مجھ سے زیادہ سعادت مند اور خوش قسمت شخص اور کون ہوگا؟"

غرضیکہ بزنطی اس قسم کے خیالات میں گم تھے اور انھیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی کہ اچانک امام رضاؑ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے انھیں "یا احمد!" کہہ کر مخاطب کیا۔ امامؑ کی آواز سن کر بزنطی کا شیرازہ خیال منتشر ہو گیا۔ اس کے بعد امام رضاؑ نے ارشاد فرمایا:

"آج تمہارے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا ہے اسے اپنے لئے فخر و مباہات اور دوسرے مسلمانوں پر باعث امتیاز قرار نہ دینا۔ کیونکہ

صعصعہ بن صوحان حضرت علی علیہ السلام کے قریب ترین دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ایک بار وہ بیمار ہوئے تو علی علیہ السلام ان کی عیادت کیلئے اس دوست کے گھر تشریف لے گئے اور بڑی دیر تک ان سے محبت اور شفقت کا سلوک کرتے رہے۔ اور کافی دیر تک صعصعہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے لیکن چلتے وقت انہوں نے اپنے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ان باتوں کو اپنے لئے ہرگز فخر و مباہات کا باعث نہ سمجھنا کیونکہ یہ تیری عظمت و بزرگی کی علامت نہیں ہے۔ میں نے یہ تمام امور اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھ کر انجام دیئے ہیں۔ لہذا کسی شخص کو یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ امور اس کے صاحب کمال ہونے کی علامت ہیں۔"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۲ ص ۱۴

(۳۸)

علیؑ کے مہمان عقیلؑ

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے زمانے میں ان کے بھائی عقیل ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر کوفہ تشریف لائے۔ حضرت علیؑ نے اپنے بڑے لڑکے یعنی امام حسنؑ کو اشارہ کیا کہ اپنے چچا کی خدمت میں ایک جوڑا کپڑا بطور تحفہ پیش کرو۔ حسن بن علیؑ نے ایک جوڑا کپڑا اور اپنی ذاتی ردا چچا عقیل کی خدمت میں پیش کردی۔ رات آگئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ حضرت علیؑ اور عقیل دارالامارہ کی چھت پر بیٹھے ہوئے گفتگو کررہے تھے۔ بات کرتے کرتے رات کے کھانے کا وقت آگیا۔ عقیل اپنے کو دربار خلافت کا مہمان سمجھتے تھے لہٰذا انھیں یہ امید تھی کہ دسترخوان انواع واقسام کی عمدہ اور رنگین غذاؤں سے سجا ہوا ہوگا۔ لیکن امید کے خلاف انھیں نہایت سادہ اور فقیرانہ دسترخوان نظر آیا تو انھوں نے انتہائی حیرت بھری نگاہوں سے دسترخوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "کھانے کے لئے جو کچھ بھی ہے بس یہی ہے؟"

علیؑ:- کیا یہ نعمت خدا نہیں ہے؟ میں تو ان نعمتوں کے لئے پروردگار کا

لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔"

عقیل :۔ پس مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلد از جلد اپنی حاجت طلب کروں اور یہاں سے فوراً رخصت ہو جاؤں۔ دراصل میں قرض کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں پس تم حکم صادر کرو کہ جلد از جلد بیت المال سے میرا قرض ادا کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ تم اپنے بھائی کی جو کچھ مدد کر سکتے ہو کر دو تاکہ میں پریشانیوں کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے اطمینان و سکون کے ساتھ گھر واپس لوٹ جاؤں۔"

"تمہارے اوپر کتنا قرض ہے؟"

"ایک لاکھ درہم۔"

"ارے، ایک لاکھ درہم! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میرے بھائی! انتہائی افسوس کے ساتھ میں یہ کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم بالکل نہیں ہے کہ میں تمہارا قرض ادا کر سکوں۔ لیکن کچھ دنوں تک صبر کرو۔ تنخواہ ملنے کا وقت قریب ہے۔ میں اپنی تنخواہ سے اپنا حصہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ بھائی کے اوپر بھائی کا جو حق ہوا کرتا ہے اسے ادا کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی سے کام نہ لوں گا اگر اہل و عیال کے اخراجات کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں اپنی پوری تنخواہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا اور اپنے لئے ایک پیسہ بھی نہ نکالتا۔"

"کیا کہتے ہو؟ میں انتظار کروں کہ تمہاری تنخواہ ملنے کا وقت آ جائے! آخر تم اس قسم کی باتیں کیوں کہہ رہے ہو؟ ملک کا سارا خزانہ اور بیت المال تمہارے ہاتھ میں ہے اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ تنخواہ ملنے کا وقت قریب ہے لہٰذا میں تنخواہ ملنے تک تمہارا انتظار کرتا رہوں؟ تو تم اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ میرے حوالے کر دو گے

بیت المال تمہارے ہاتھوں میں ہے اور تم مجھ سے تنخواہ کے دن کا حوالہ دے رہے ہو۔ پھر یہ بتاؤ کہ بیت المال سے تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ فرض کرو تم اپنی پوری تنخواہ بھی میرے حوالے کر دیتے ہو تو بھی اس سے میرا مقصد حاصل ہونے والا نہیں ہے۔"

"مجھے آپکی تجویز پر بے پناہ حیرت ہے۔ حکومت کے خزانے میں روپیہ ہے کہ نہیں اس سے میرا یا تمہارا کیا سروکار ہے؟ ہماری اور تمہاری بھی وہی حیثیت ہے جو دوسرے مسلمان بھائیوں کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تم میرے بھائی ہو لہذا میرے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں مگر مدد بیت المال سے نہیں بلکہ ذاتی ملکیت سے کی جاتی ہے۔"

غرضکہ بحث و گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اور عقیل اپنے بھائی علیؑ سے بار بار یہ کہتے رہے کہ بیت المال کا دروازہ کھول کر انکی مطلوبہ رقم انھیں دیدی جائے تاکہ وہ لوگوں کا قرض ادا کر کے اطمینان کی سانس لے سکیں

یہ لوگ جس جگہ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے وہاں سے کوفے کا بازار بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ تاجروں کے ذاتی خزانے اور روپیے پیسہ کا صندوق بھی دار الامارہ کی چھت سے ایک دم صاف دکھائی پڑ رہا تھا عقیل بار بار اپنے بھائی علیؑ سے خوشامدانہ انداز میں اصرار کرتے جا رہے تھے کہ "تم بیت المال کا دروازہ کھول کر ہمیں بہت سا روپیہ دیدو تاکہ میری پریشانی ختم ہو جائے۔"

حضرت علیؑ نے عقیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم بار بار اصرار

کرتے چلے جا رہے ہو اور میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر قطعی توجہ نہیں دیتے۔ اچھا اگر تم نہیں مانتے تو پھر میں تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ تم اس ترکیب پر عمل کرو، تمہارا سارا قرض ادا ہو جائے گا اور اس کے بعد بھی اچھی رقم تمہارے ذاتی اخراجات کے لئے بچ جائے گی۔"

"یا علیؑ آخر وہ کونسی ترکیب ہے؟"

"دیکھو نیچے بازار میں بہت سے صندوق پڑے ہوئے ہیں۔ رات کا وقت ہے اور اس وقت بازار میں بالکل سناٹا چھایا ہوا ہے۔ تم یہاں سے نیچے اتر جاؤ اور صندوقوں کا تالا توڑ کر جتنی دولت نکالنا چاہو نکال لو۔"

"یہ صندوق کس کے ہیں؟"

"یہ ان محنت مزدوری کرنے والے تاجروں کی ملکیت ہیں۔ یہ لوگ دن بھر خرید و فروخت کرتے ہیں اور اپنا نقد روپیہ ان صندوقوں میں بند کر کے گھر چلے جاتے ہیں۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔ تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ لوگوں کا صندوق توڑ کر ان غریبوں کا مال لے لوں جو دن بھر محنت مزدوری اور ہزار پریشانیوں کے بعد کماتے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ساری پونجی ان صندوقوں میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، تو کیا تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں ان کی جمع پونجی لے کر چلا جاؤں؟"

"پس آپ مجھے ایسا مشورہ کیوں دیتے ہیں اور اس بات پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں کہ میں مسلمانوں کے بیت المال کا تالا کھول کر آپ کی مطلوبہ

رقم آپ کے حوالے کر دوں؟ آپ خود ہی بتایئے کہ یہ بیت المال کس کا ہے؟ دراصل یہ ان لوگوں کا مال ہے جو اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے ہیں۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ بیت المال میری ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ جس طرح رات کے سناٹے میں تاجروں کے صندوق کا تالا توڑنا ایک ناجائز حرکت ہے اسی طرح ذاتی مقاصد کے لیے بیت المال کا دروازہ کھولنا بھی جرم ہے۔ اچھا میں آپ کو دوسری ترکیب بتاتا ہوں اگر یہ ترکیب پسند آ جائے تو اس سے بھی آپ کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔"

"دوسری ترکیب کیا ہے؟"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی تلوار ہاتھ میں لیجئے اور میں بھی اپنی تلوار اٹھاتا ہوں۔ کوفے کے نزدیک ہی ایک شہر قدیم ہے جس کا نام حیرہ ہے، اس جگہ بہت سے دولت مند سوداگروں اور تاجروں کا گھر ہے۔ رات کے سناٹے میں ہم دونوں بھائی "حیرہ" چلتے ہیں اور ان سوداگروں میں سے کسی ایک کے گھر ڈاکہ ڈال کر بہت ساری دولت اٹھا لاتے ہیں۔"

"اے جان برادر! میں یہاں چوری کرنے یا ڈاکہ ڈالنے نہیں آیا ہوں کہ تم مجھے اس قسم کی ترکیب بتا رہے ہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ملک کے خزانے سے جو اس وقت تمہارے قبضے میں ہے، مجھے اتنی رقم عنایت کر دو کہ میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"اگر ہم دونوں آدمی مل کر ایک آدمی کا مال چرا لیں تو بہتر ہے نہ یہ کہ تمام مسلمانوں کی ملکیت سے چوری کرنا مناسب ہے؟ آخر یہ کیسا فلسفہ اور کونسی

منطق ہے جس میں شمشیر کی مدد سے ایک آدمی کا مال اٹھا لینا چوری ہے اور بیت المال سے عام مسلمانوں کا مال نکال لینا چوری نہیں ہے۔ بشاید تمہارے نزدیک چوری اور لوٹ کھسوٹ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی طاقت کے زور پر کسی دوسرے شخص کا مال چھین لے۔ میرے بھائی تم بیت المال کا دروازہ کھول کر روپیہ نکالنے کی بات کرتے ہو، مگر تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تم جس چیز کا مشورہ دے رہے ہو وہ چوری کی بدترین قسم ہے"۔

ا؎ بحارالانوار جلد ۹ مطبوعہ تبریز ص ۴۱۳

(۳۹)

خوفناک خواب

وہ خواب دیکھ کر بے حد خوفزدہ تھا۔ اور ہمہ وقت اس کی نگاہوں میں اس خوفناک خواب کی مختلف تعبیریں نظر آرہی تھیں۔ وہ بہت گھبرایا ہوا امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔"

"میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ ایک لکڑی کا آدمی لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہے اس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے اور وہ اس تلوار کو فضا میں لہرا رہا ہے۔ میں یہ خواب دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہوگیا ہوں میری نگاہوں کے سامنے ہر لحہ وہی خوفناک خواب ناچا کرتا ہے۔ پس آپ اس خواب کی تعبیر بتا دیں تاکہ مجھے اس خوف سے نجات حاصل ہو جائے۔"

امامؑ: تیری نگاہیں ایک آدمی کی دولت پر لگی ہوئی ہیں اور تو ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی ترکیب سے اس آدمی کا مال ہڑپ لے۔ تو اس خدا سے ڈر اور اس قسم کے فیصلے سے باز آجا۔"

یقیناً آپ حقیقی عالم ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے معدنِ علم سے علم حاصل کیا ہے۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میرے دل میں ایسا خیال ضرور تھا۔ در اصل میرے پڑوسی کے پاس بہت بڑی زمینداری ہے۔ اس کو روپئے کی سخت ضرورت ہے لہذا وہ اپنی جائداد فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اور فی الحال میرے علاوہ اس کی زمین کا کوئی دوسرا خریدار نہیں ہے۔ ان دنوں میں اس فکر میں پڑا ہوا تھا کہ اس کی ضرورت سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے کم قیمت میں اس کی بہت بڑی جائداد خرید لوں[1]"

---

[1] وسائل جلد دوم ص ۵۸۲

(۴۰)

ظلۂ بنی ساعدہ میں

رات کا وقت اور برسات کا موسم تھا۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے تاریک اور سنسان ماحول میں امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے گھر سے تنہا برآمد ہوئے اور ظلۂ بنی ساعدہ کی طرف چل پڑے۔ اتفاقاً امامؑ کے قریب ترین صحابی معلی بن خنیس نے، جو امام کے گھریلو اخراجات کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، انھیں گھر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کیا کہ ایسی خوفناک تاریکی میں امام کا گھر سے تنہا نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا وہ آہستہ آہستہ امام کے پیچھے چل پڑے۔ ان کے اور امام جعفر صادقؑ کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ امام کا سایہ انھیں بہ آسانی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ نہایت خاموشی کے ساتھ امام کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ اچانک انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے امام کے کندھے سے کوئی چیز زمین پر گر پڑی ہو۔ پھر انہوں نے امام کی ہلکی سی آواز بھی سنی۔ وہ کہہ رہے تھے: "اے میرے پروردگار! اسے مجھے واپس لوٹا دے۔"

اسی اثنا میں معلی امام کے سامنے پہنچ گئے اور سلام عرض کیا۔
امام نے آواز ہی سے پہچان لیا کہ یہ معلی ہیں۔ ارشاد فرمایا۔
"تم معلی ہو!"
"جی ہاں! میں معلی ہوں۔"
امام کے سوال کا جواب دینے کے بعد معلی نے غور سے یہ دیکھنا شروع کیا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جو امام کے کندھے سے زمین پر گر پڑی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ زمین پر کچھ روٹیاں بکھری ہیں۔
امام: ان روٹیوں کو جمع کر لو اور مجھے دیدو۔"
معلی نے روٹیوں کو زمین سے اٹھا کر امام کے سپرد کر دیں۔ روٹیوں کو جمع کرنے کے بعد معلی نے دیکھا کہ اتنا بڑا بوجھ ہے جسے ایک آدمی بڑی مشکل سے اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہے۔
معلی: "اگر آپ اجازت دیں تو یہ بوجھ میں اٹھا لوں۔"
امام: نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کام کے لیے میں تم سے زیادہ بہتر ہوں۔"
امام نے روٹیوں کا بوجھ اپنے کندھے پر سنبھالا اور دونوں آدمی ساتھ ساتھ چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد یہ لوگ ظلۂ بنی ساعدہ میں پہنچ گئے۔ اس جگہ فقیروں اور بے سہارا لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جن لوگوں کا کہیں ٹھکانہ نہیں ہوا کرتا تھا وہ ظلۂ بنی ساعدہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔

ان لوگوں نے دیکھا کہ طلاء بنی ساعدہ میں تمام لوگ بے خبر سو رہے ہیں۔ امام نے روٹیوں کا تھیلا نہایت آہستگی کے ساتھ زمین پر رکھا پھر ہر آدمی کے کپڑے کے نیچے ایک ایک، دو دو روٹیاں رکھ دیں ہر ایک کے سرہانے روٹیاں رکھتے وقت امام بار بار یہ دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی شخص چھوٹنے نہ پائے۔ جب سب کو روٹیاں تقسیم کر چکے تو معلی سے اشارہ کیا کہ آؤ واپس چلیں۔

معلی: "اس اندھیری رات میں آپ نے ان لوگوں کے لئے روٹیاں لانے کی زحمت گوارہ کی، کیا یہ سب لوگ شیعہ ہیں اور ان سب کو آپکی امامت پر اعتقاد ہے؟"

"نہیں یہ لوگ امامت پر اعتقاد نہیں رکھتے اگر یہ لوگ امامت کے معتقد ہوتے تو میں روٹیوں کے ساتھ نمک بھی لایا ہوتا۔"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۱۱۰، وسائل جلد ۲ مطبوعہ امیر بہادر ص ۴۹

(۴۱)

یہودی کا سلام

رسول مقبولؐ کی بیوی عائشہ ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک یہودی آیا اور السلام علیکم کہنے کے بجائے اس نے کہا "السام علیکم" یعنی تم سب کو موت آجائے"۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک دوسرا یہودی خدمت رسول میں حاضر ہوا اور اس نے بھی "السلام علیکم" کہنے کے بجائے "السام علیکم" کہا۔ غرضکہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ ایک منصوبے کے تحت رسول اکرم کی دل آزاری کرنا چاہتے ہیں عائشہ یہودیوں کی اس حرکت پر بہت غضبناک ہوئیں اور چلا کر کہا "تم سب لوگوں کو موت آجائے۔"

رسول اکرم نے ارشاد فرمایا۔ "ناسزا باتیں مت کہو۔ اگر ان ناگوار اور ناسزا باتوں نے جسم اختیار کیا ہوتا تو ان کی صورت نہایت مکروہ ہوتیں۔ اس کے برخلاف نرمی، ملائمت اور بردباری ہر چیز کو نہایت خوبصورت، زیبا اور دلکش بنا دیا کرتی ہے۔" محبت اور نرمی

انسان کی زینت کو دو بالا کر دیا کرتی ہیں۔ اور اگر کسی چیز میں نرمی، ملائمت اور بردباری کی کمی ہوتی ہے تو اس چیز کی خوبصورتی اور زیبائی کم ہو جایا کرتی ہے۔ آخر تم اس قدر ناراض اور غضبناک کیوں ہو گئیں؟

عایشہ: "یا رسول اللہ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ ذلت آمیز اور انتہائی بے شرمی کے انداز میں سلام علیکم کے بجائے کیا کہہ رہے ہیں؟" "تو کیا ہوا، شاید تم نے غور نہیں کیا کہ میں نے بھی ان لوگوں کے جواب میں ہی تو کہا ہے "علیکم" یعنی تم پر۔ بس ان کے جواب کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔"[1]

---

[1] وسائل جلد ۲ ص ۲۱۲

(۴۲)

ابوذرؓ کے نام ایکؑ خط

ابوذر کو ایک خط ملا۔ انہوں نے اسے کھول کر پڑھا۔ خط بہت دور سے آیا تھا۔ ایک شخص نے خط کے ذریعہ نصیحت کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ شخص ابوذر کی شخصیت سے بخوبی واقف تھا، اسے معلوم تھا کہ رسول اکرمؐ ابوذر کو بہت عزیز رکھتے تھے اور رسول مقبولؐ کی خدمت میں ابوذر نے علم و حکمت کی اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔

ابوذر نے خط کے جواب میں اس شخص کو صرف ایک اور نہایت مختصر جملہ تحریر فرمایا۔ "اپنے محبوب ترین دوست کے ساتھ کسی قسم کی کوئی برائی اور دشمنی نہ کرو۔" یہ جملہ لکھ کر ابوذر نے خط کا جواب روانہ کر دیا۔

کچھ دنوں بعد نصیحت طلب کرنے والے شخص کو ابوذر کا جواب مل گیا۔ لیکن خط کا مضمون اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ کہنے لگا: "آخر یہ کیسا ہے؟ اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ جس شخص کو بہت زیادہ محبوب رکھتا ہے اس سے دشمنی مت کر۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟

یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے آخر اس میں کون سی خاص بات ہے کیا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے عزیز ترین محبوب کے ساتھ عداوت اور برائی سے کام لے؟" برائی اور دشمنی تو بہت بڑی بات ہے، آدمی تو اپنے محبوب کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور سب کچھ قربان کر دیا کرتا ہے۔

غرضکہ وہ شخص کافی دیر تک غور و فکر کرتا رہا۔ وہ بار بار یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہنے والے نے یہ جملہ یوں ہی کہہ دیا اس کے اندر عقل و حکمت کا کوئی رمز یقیناً پوشیدہ ہے۔ اس جملے کا لکھنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ اسے رسول کے عزیز ترین صحابی ابوذر نے تحریر فرمایا ہے، جنھیں لقمان امت کا لقب حاصل ہے اور جن کی دانشمندی میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال وہ شخص اس جملے کا مطلب نہ سمجھ سکا اور مزید وضاحت کے لیے ابوذر کے پاس دوبارہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

ابوذر نے وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔ "میرے نزدیک محبوب ترین شخص سے مراد کوئی اور نہیں بلکہ خود تیری ہی ذات ہے، تو تمام لوگوں سے اپنی ذات کو بہت زیادہ عزیز رکھتا ہے اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ اپنے محبوب ترین عزیز کے ساتھ کسی قسم کی برائی اور دشمنی نہ کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنی ذات کے ساتھ خصمانہ اور معاندانہ سلوک مت کرو۔ شاید تجھے نہیں معلوم کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی وجہ سے خود اس کی ذات کو چوٹ لگتی ہے اور ارتکاب گناہ کے ذریعے وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔"[۱]

۱۔ ارشاد دیلمی۔

(۴۳)

غیر معیّن مزدوری

اس دن سلیمان بن جعفر جعفری اور امام رضا علیہ السلام کسی کام کے لیے ساتھ ساتھ گئے ہوئے تھے سارا دن کام کرتے کرتے آفتاب غروب ہوگیا تو سلیمان بن جعفر نے گھر واپس لوٹنا چاہا۔ علی ابن موسی الرضاؑ نے ان سے کہا: "اے جعفر! آج کی رات تم میرے ہی یہاں رک جاؤ۔" جعفر نے حکم امام کی اطاعت کی اور امام کے ساتھ ان کے گھر تشریف لے گئے۔

گھر پہنچ کر امام نے دیکھا کہ سبھی غلام گلکاری میں مشغول ہیں۔ اسی اثنا میں امام کی نظر ایک اجنبی آدمی پر پڑی جو تمام دوسرے لوگوں کے ساتھ کام میں مصروف تھا۔ امامؑ نے پوچھا:

"یہ کون ہے؟"

غلاموں نے جواب دیتے ہوئے کہا: "اس آدمی کو ہم لوگوں نے آج مزدوری پر لگایا ہے تاکہ سارا کام جلد از جلد ختم ہو جائے۔"

"تم لوگوں نے بہت اچھا کیا۔ اب یہ تو بتاؤ کہ اس شخص کی کیا مزدوری

معین کی ہے ؟"

"اس کو ہم لوگ کام ختم ہو جانے کے بعد اس کی خوشی کے مطابق کچھ دے دیں گے ۔"

یہ سنکر امامؑ کے چہرے پر ناراضگی اور غصہ کے آثار نمودار ہو گئے انھوں نے انتہائی غضبناک انداز میں غلاموں کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ تازیانے سے غلاموں کی تادیب کریں گے ۔ اتنے میں سلیمان جعفری امام کے سامنے آگئے اور بولے ۔"آپ اس قدر غمگین اور پریشان کیوں ہو گئے ؟"

امام نے ارشاد فرمایا : " میں ان لوگوں سے متعدد بار کہہ چکا ہوں کہ مزدوری معین کئے بغیر کسی آدمی کو کام پر نہ لائیں ۔ پہلے مزدور کی مزدوری معین ہونی چاہئے تب ہی اسے کام پر لگانا مناسب ہوا کرتا ہے کام کے ختم ہونے پر معین کردہ مزدوری کے علاوہ بھی اگر اسے کچھ دیدیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ اگر معین شدہ مزدوری سے اسے کچھ زیادہ ملے گا تو وہ آپ کا ممنون اور شکر گزار بھی ہو گا اور بڑی خوشی کے ساتھ آپ کے گھر سے رخصت ہو گا ۔ تمہارے اور اس مزدور کے درمیان تعلقات استوار ہو جائیں گے اور آئندہ جب کبھی ضرورت ہو گی وہ تمہارے کام کے لیے فوراً آجائے گا ۔ اگر آپ نے معین کردہ مزدوری ہی ادا کرنے پر اکتفا کی تو بھی وہ شخص آپ سے ناراض نہیں ہو گا ۔ لیکن اگر مزدوری طے کئے بغیر آپ نے کسی شخص

کو کام پر لگا دیا ہے تو کام ختم ہونے کے بعد آپ اسے چاہے جتنی زیادہ مزدوری دیدیں پھر بھی وہ یہ خیال نہیں کرے گا کہ آپ نے اس کے ساتھ محبت کا سلوک کیا ہے بلکہ وہ یہ سوچے گا کہ اسے مزدوری کچھ کم ملی ہے[۱]۔"

۱۔ بحارالانوار جلد ۱۲ صفحہ ۳۱

maablib.org

(۴۴)

آزاد ہے یا غلام

ایک گھر سے ناچ گانے کی آواز بلند ہو رہی تھی، گھر کے قریب سے گزرنے والے شخص کو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی تھی کہ اندرون خانہ کیا ہو رہا ہے! شراب و کباب اور عیش و عشرت کی محفل گرم تھی، جام سے جام ٹکرا رہے تھے۔ اس گھر کی کنیز کوڑا وغیرہ لئے ہوئے باہر نکلی تھی تاکہ اسے ایک کنارے پھینک دے۔ اسی اثنا میں ایک شخص، جس کے چہرے سے عبادت گزاری کے آثار نمایاں تھے اور جس کی پیشانی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ یقیناً یہ کوئی عابد شب زندہ دار ہے، اس گھر کے قریب سے گزر رہا تھا، کنیز کو گھر سے باہر آتا ہوا دیکھ کر وہ شخص اپنی جگہ پر ٹھہر گیا اور جب کنیز اس کے قریب آگئی تو اس سے پوچھا:"

"اس گھر کا مالک آزاد ہے یا غلام؟"

"آزاد۔"

" معلوم ہے کہ آزاد ہے ۔ اگر غلام ہوتا تو یقیناً اپنے آقا و مالک پروردگار عالم کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے اس قسم کی محفل آرائی سے پرہیز ضرور کرتا۔"

غرضکہ کنیز اور اس مرد متقی کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کی وجہ سے اسے گھر لوٹنے میں کچھ دیر لگی ، جیسے ہی وہ کنیز گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس کے مالک نے پوچھا " آخر تو نے اتنی دیر کیوں لگائی ۔ ؟ "

کنیز نے پورا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا : " ایک شخص جو شکل و صورت سے بڑا متقی و پرہیز گار معلوم ہو رہا تھا ، میرے گھر کے قریب سے گذرا اور اس نے مجھ سے یہ سوال کیا اور میں نے اس کا یہ جواب دیا ، پھر وہ یہ باتیں کہہ کر چلا گیا اور میں گھر واپس آ گئی ۔"

کنیز کی بات سن کر وہ شخص بہت خوفزدہ ہو گیا اور اس مرد متقی کی بات اور خصوصاً اس کے اس جملے پر غور کرنے لگا : " اگر غلام ہوتا تو یقیناً اپنے آقا کی خواہش کا احترام کرتا ۔" تیر کی طرح یہ بات اس کے دل پر جا لگی اور وہ بے تحاشہ ننگے پیر اس آدمی کی طرف دوڑنے لگا جس نے یہ بات کہی تھی ۔ بدحواسی کے عالم میں وہ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑتا ہوا اس شخص کے قریب پہونچ گیا ۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ساتویں امام حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام تھے ۔ اس شخص نے امام کے سامنے توبہ کی ۔ چونکہ توبہ کرتے وقت وہ ننگے پیر تھا لہٰذا اس نے پھر پاپوش نہیں پہنا اور تمام عمر ننگے پیر چلتا رہا ۔ توبہ سے قبل وہ شخص بشیر بن حارث بن عبد الرحمٰن مروزی

کے نام سے مشہور تھا، لیکن اس کے بعد وہ پوری عمر "الحافی" یعنی ننگے پیر والا کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا۔ اور بعد میں بشر حافی کے نام سے مشہور ہوگیا اس کے بعد وہ جب تک زندہ رہا اپنے عہد و پیمان پر پوری طرح ثابت قدم رہا اور نہایت وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے پھر گناہ کے قریب نہیں گیا۔ اس سے قبل وہ علاقے کے ثروتمند اشخاص اور اشراف زادوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن بعد کی زندگی میں وہ خدا پرست متقی اور پرہیزگار لوگوں کی فہرست میں شمار کیا جانے لگا۔[1]

---

[1] الکنی والالقاب محدث قمی جلد ۲ ذیل عنوان "الحافی" صفحہ ۱۵۳ بہ نقل از علامہ در منہاج الکرامہ۔

۴۵

میقات میں

مدینہ کے مشہور و معروف فقیہہ مالکؒ ابن انس ایک سال سفر حج میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ یہ لوگ میقات میں پہونچ گئے اور جب احرام باندھنے و ذکر معروف یعنی لبیک اللّٰھم لبیک ادا کرنے کا وقت آگیا، دوسرے تمام حاجیوں نے معمول کے مطابق اس ذکر کو اپنی زبان سے ادا کیا۔

ؒ مالک ابن انس بن مالک بن ابی عامر اہل سنت والجماعت کے چار اماموں میں ایک تھے۔ مشہور و معروف مالکی مذہب انہیں سے منسوب ہے۔ وہ ابوحنیفہ کے ہم عصر تھے۔ شافعی مالک کے شاگرد تھے اور احمد بن حنبل شافعی کے شاگرد تھے۔

فقہی اعتبار سے مالک اور ابوحنیفہ کے مسلک میں بڑا فرق تھا۔ اور کسی حد تک یہ دونوں مسالک ایک دوسرے کی ضد شمار کئے جاتے تھے۔ کیونکہ ابوحنیفہ زیادہ تر اپنی رائے اور قیاس سے کام لیتے تھے۔ اس کے برعکس مالک کا فقہی مسلک زیادہ تر سنت اور حدیث پر بھروسہ کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابن خلکان نے اپنی کتاب وفیات الاعیان جلد ۳ ص ۲۸۴ میں نقل کیا ہے کہ مالک اپنی موت سے قبل بہت رویا کرتے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کچھ فتوے اپنی رائے اور قیاس کے مطابق صادر کردئے تھے اور اپنی عمر کے آخری حصے میں انھیں اس غلطی کا شدت کے

مالک ابن انس امام جعفر صادق کی طرف متوجہ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ امام کا حال بالکل منقلب ہے جیسے ہی اس ذکر کو اپنی زبان پر لانا چاہتے ہیں ان پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور انھیں اپنے اعصاب بدن پر اتنا بھی اختیار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنی

ساتھ احساس ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اپنی رائے کے مطابق صادر کئے گئے فتوے کا خیال آتا تھا تو ان پر بے تحاشہ گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اور بے اختیار یہ کہنے لگتے تھے۔ "کاش میں نے اپنی رائے کے مطابق یہ فتویٰ نہ صادر کیا ہوتا۔ اور میں اس بات کے لئے بخوشی راضی ہوں کہ ہر فتوے کے عوض میں مجھے ایک ایک تازیانہ لگایا جائے تاکہ میں ان گناہوں سے سبکدوش ہو جاؤں۔

مالک کے مسلک کی سب سے خاص اور اہم بات یہ ہے کہ وہ محمد ابن عبداللہ محض کی بیعت کو درست مانتے ہیں۔ اس مسلک کے نزدیک بنی عباس کی، جنھوں نے طاقت کے زور پر خلافت حاصل کی تھی، بیعت درست نہیں ہے۔ مالک اپنے اس عقیدے کے اظہار سے قطعی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ انھیں بنی عباس کے رعب و دبدبے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سفاح و منصور کے چچا جعفر بن سلیمان عباسی کے حکم سے انہیں سخت تازیانے لگائے گئے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ عباسی حکومت کی طرف سے لگائے جانے والے تازیانوں کی بدولت مالک کی شہرت و مقبولیت اور احترام میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ وفیات الاعیان جلد ۳ کے ص ۲۸۵ پر اس سلسلے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

مدینے میں قیام کے دوران مالک امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں برابر آیا جایا کرتا تھا یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے امام سے حدیث بھی نقل کی ہے۔ بحار الانوار کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام مالک کو بہت چاہتے تھے اور اکثر مالک کو مخاطب ہو کر کہا کرتے تھے۔ "میں تمھیں بہت عزیز رکھتا ہوں۔" اور مالک امام کے منہ سے اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہو جایا کرتے تھے۔ الامام الصادق نامی کتاب نے نقل کیا ہے کہ مالک اکثر کہا کرتے تھے۔ "میں ایک مدت تک امام صادقؑ کے حضور میں آیا جایا کرتا تھا اور میں امام کو ہمیشہ نماز، روزہ یا تلاوت قرآن کے عالم میں ہی پایا کرتا تھا۔ عبادت، علم

سواری پر اپنے آپ کو سنبھال سکیں، بدن میں ایسی تھرتھراہٹ تھی جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی سواری سے گر جائیں گے ۔ یہ دیکھ کر مالک امام جعفر صادقؑ کے سامنے آئے اور کہا "یا ابن رسول اللہ! جس طرح ممکن ہو اس ذکر کو بجا لائیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

امام نے ارشاد فرمایا "اے ابی عامر کے بیٹے! یہ جسارت میں کیسے کروں لبیک کہنے کی جرأت کہاں سے لاؤں؟ لبیک کہنے کا مطلب یہ ہے اے میرے پروردگار تو مجھے جس چیز کے لئے طلب کرتا ہے، میں ہمہ تن اسے قبول کرتا ہوں اور ہمیشہ ہر خدمت کے لئے آمادہ ہوں۔ میں کس زبان سے اپنے پروردگار سے اس طرح کی گستاخی کروں اور اپنے آپ کو ایک آمادہ بخدمت بندے کی حیثیت سے کیسے پیش کروں! اگر میرے جواب میں یہ کہہ دیا گیا: "لا لبیک" تو اس وقت میں کیا کروں گا۔"[1]

تقویٰ اور پرہیزگاری کے میدان میں ان سے بڑا فاضل میری آنکھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔"

بحار الانوار کے بیان کے مطابق یہی مالک امام صادقؑ کے بارے میں یوں کہتے ہیں: "وہ (امام صادقؑ) بلند مرتبہ عبادت گذار اور پرہیزگار تھے۔ وہ اپنے پروردگار سے بہت ڈرتے تھے اور انھیں رسول اکرمؐ کی بہت سی حدیثیں یاد تھیں۔ وہ ایک نہایت خوش اخلاق شخص تھے اور ان کے پاس بیٹھ کر بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان کی صحبت یا ان کی مجلس میں بیٹھ کر لوگ ہر طرح کی فیوض و برکات حاصل کیا کرتے تھے۔ رسول خداؐ کا نام سنتے ہی ان کے چہرے کی رنگت بدل جایا کرتی تھی۔

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۱۰۹

(۴۶)

درخت کا بوجھ

علی ابن ابیطالب علیہ السلام گھر سے باہر تشریف لائے اور حسب معمول جنگل کی طرف چل پڑے۔ باغوں میں کام کرنے کی وجہ سے وہ جنگل کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے بخوبی واقف تھے ان کے ساتھ ایک بوجھ بھی تھا۔ ایک شخص نے پوچھا "یا علی! تمہارے ساتھ کیا چیز ہے؟"

علیؑ: "انشاءاللہ، درخت خرما۔"

اس شخص نے حیرت آمیز لفظوں میں کہا: "درخت خرما؟" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ حضرت علیؑ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

اس شخص کی حیرت اس وقت بالکل دور ہو گئی جب ایک مدت کے بعد اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اس روز علیؑ خرمے کی جو پود اپنے ہمراہ لئے جا رہے تھے اور جس کے بارے میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ آئندہ یہ تناور درخت خرما کی شکل اختیار کریں گے، وہ آج ایک سبز و شاداب نخلستان کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اور حضرت علیؑ نے کل خرمے کے پودے لگائے تھے آج وہ تمام پودے ایک تناور اور نہایت عمدہ درخت بن چکے ہیں۔[1]

---

1. وسائل جلد ۲، ص ۵۳۱ و بحار الانوار جلد ۹، ص ۵۹۹

(۴۷)

محنت کا پسینہ

امام کاظمؑ اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے۔ وہ کھیت کی زمین کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ان کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں علی بن ابی حمزہ نامی ایک شخص امام کے قریب پہنچے اور عرض کیا:

"میری جان آپ پر قربان ہو جائے۔ آپ نے یہ کام دوسرے لوگوں کے سپرد کیوں نہیں کر دیا؟"

"آخر میں اس کام کو دوسرے لوگوں کے سپرد کیوں کروں! مجھ سے بہتر لوگوں نے بھی ہمیشہ اس قسم کے کام خود ہی انجام دیئے ہیں۔"

"مثلاً وہ کون لوگ ہیں؟"

"رسولِ خدا، امیر المومنین علی بن ابیطالب اور ہمارے آباو اجداد میں سبھی لوگوں نے اس قسم کی خدمات انجام دی ہیں۔ بنیادی طور پر کھیتوں میں کام کرنا پیغمبران خدا، ان کے نوابین اور دیگر بندگان خدا کی سیرت رہی ہے۔"

ۓ بحار الانوار، جلد ۱۱ ص ۲۶۴ و وسائل جلد ۲ ص ۵۲۱

(۴۸)

دوستی جو ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی

شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ مثالی دوستی ہوگئی اور وہ رفیق جو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے تھے وہ اب بالکل علیحٰدہ ہوگئے۔ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ ایک دن کے لئے بھی ایک دوسرے سے علیحٰدہ نہیں ہوئے۔ عالم یہ تھا کہ لوگ دونوں کے اصلی نام سے ناواقفیت کی صورت میں ایک دوسرے کا دوست کہکر آواز دیا کرتے تھے۔ ان لوگوں سے خطاب کرتے وقت اکثر لوگ انھیں ان کے اصلی نام سے پکارنے کے بجائے یہ کہتے تھے:

"رفیق ..."

جی ہاں ــ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے دوست کی حیثیت سے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کرلی تھی لیکن اس دن بھی یہ لوگ حسب معمول ایک دوسرے کے ساتھ ہی تھے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ ایک جوتا بنانے والے کی دوکان پر تشریف

ے گئے۔ کیا کوئی یہ یقین کرسکتا ہے کہ گہرے دوست کی حیثیت سے رہنے والے لوگ بازار سے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔ اور ان کی دوستی بالکل ختم ہو جائے گی؟

اس روز بھی ہمیشہ کی طرح وہ امام کے ساتھ ہی جا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بازار میں داخل ہوئے۔ اس کا سیاہ پوست غلام بھی اس دن اس کے ہمراہ تھا۔ اور اپنے مالک کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو غلام نظر نہ آیا۔ چند قدم اور چلنے کے بعد اس نے گردن گھما کر دیکھا لیکن غلام "ندارد" تھا۔ پھر اس نے تیسری بار پلٹ کر دیکھا مگر غلام نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بازار میں کھیل تماشہ دیکھنے میں لگ گیا اور اسے یہ احساس نہ ہوا کہ اس کا مالک اور دوسرے لوگ آگے بڑھ گئے ہیں۔ غرضکہ اس کے مالک نے چوتھی بار پلٹ کر دیکھا تو غلام اس کے پیچھے کھڑا تھا اس نے غلام کو دیکھتے ہی انتہائی غصے میں کہا:

"حرام زادے! تو کہاں تھا؟"

اپنے دوست کے منہ سے یہ جملہ سننے کے بعد امام جعفر صادقؑ کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ امام نے اپنا ہاتھ بلند کیا پھر زور سے اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"سبحان اللہ! تم اس کی ماں کو گالی دے رہے ہو؟ تم اس کی ماں کو ناجائز کام سے منسوب کر رہے ہو؟! میں یہ خیال کرتا تھا کہ تم ایک

متقی اور پرہیزگار آدمی ہو۔ لیکن آج یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ تمہارے اندر تقویٰ و پرہیزگاری نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"یا ابن رسول اللہ، یہ غلام اصلاً سندھی ہے اور اس کی ماں بھی سندھ کی رہنے والی ہے۔ آپ خود ہی واقف ہیں کہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ پھر اس غلام کی ماں کوئی مسلمان خاتون نہیں کہ میں نے اس پر ناجائز کام کی تہمت لگادی ہے۔"

"اس کی ماں کافر تھی سو تھی۔ ہر قوم میں شادی کا ایک قانون اور مخصوص طریقہ ہوا کرتا ہے۔ اگر اس قوم کے لوگ اپنے قومی قانون اور طور طریقے کی پیروی کرتے ہوئے شادی کرتے ہیں تو ان کا عمل زنا قطعی نہیں ہے۔ اور ان کے لڑکوں کو زنازادہ یا حرام زادہ نہیں شمار کیا جاسکتا۔"

امام جعفر صادقؑ نے پھر اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "تم اسی وقت مجھ سے دور ہو جاؤ اور آئندہ میرے ساتھ کبھی نہ آنا۔"

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ کو اس آدمی کے ساتھ لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر گزر گئی مگر ان دوستوں کے درمیان علیحدگی اور جدائی برقرار رہی۔[1]

---

[1] کافی جلد ۲، باب البذاء، صفحہ ۳۲۴ و وسائل جلد ۲، صفحہ ۴۷۷

(۴۹)

ایک گالی

ایران کے مشہور دانشور عبداللہ بن مقنع کا غلام اپنے مالک کے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے بصرہ کے گورنر سفیان بن معاویہ مہلبی کے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے مالک کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ اپنا کام ختم کر کے باہر آئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف لوٹ جائے۔

وہ کافی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ابن مقنع باہر نہ آئے۔ دوسرے تمام لوگ جو ابن مقنع کے بعد گورنر کے پاس گئے تھے وہ سب واپس آچکے تھے مگر ابن مقنع کی کوئی خبر نہ تھی۔ ایک طویل انتظار کے بعد اس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔ ہر آدمی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ غلام کی بے چینی بڑھتی رہی چنانچہ اس نے گورنر کے گھر سے باہر نکلنے والے ہر شخص سے اپنے مالک کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔ کوئی یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا تھا کہ مجھے نہیں معلوم۔ اور اکثر لوگ ایسے تھے جو سوال سن کر اس غلام کو گھورتے ہوئے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا

کرتے تھے۔

کافی دیر ہو گئی تو غلام انتہائی مایوسی کے عالم میں عیسیٰ و سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عیسیٰ و سلیمان علی بن عبد اللہ بن عباس کے لڑکے اور خلیفہ منصور دوانیقی کے چچا تھے۔ ابن مقفع ان لوگوں کا دبیر اور کاتب تھا۔

غلام نے عیسیٰ و سلیمان سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

عیسیٰ و سلیمان، عبد اللہ بن مقفع جیسے بلند مرتبہ دانشور، مایۂ ناز مصنف اور چیرہ دست مترجم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اس کی پوری سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اور ابن مقفع بھی ان لوگوں سے بڑی محبت اور ان کی بھرپور حمایت کرتا تھا۔ وہ فطری طور پر ایک جسور اور بدزبان آدمی تھا دوسروں کو زبان کے تیر سے گھائل کر دینے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ اور کوتاہی سے کام نہ لیتا تھا۔ خلیفہ وقت کے چچا عیسیٰ اور سلیمان کی بھرپور حمایت نے اسے اور زیادہ جسور اور گستاخ بنا دیا تھا۔

بہرحال عیسیٰ اور سلیمان نے بصرہ کے گورنر سفیان بن معاویہ سے ابن مقفع کو طلب کیا۔ اس نے جواب دیا کہ "دراصل مجھے ابن مقفع کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اور نہ ہی وہ میرے گھر آیا ہے۔" لیکن بہت سے لوگوں نے اسے گورنر کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا چنانچہ دیکھنے والوں کی چشم دید گواہی کے بعد گورنر کے پاس اس کی گنجائش نہ رہ گئی کہ وہ حقیقت سے انکار کر سکے۔

یہ ایک معمولی بات نہ تھی بلکہ ایک شخص کے قتل کا معاملہ تھا اور وہ بھی ابن مقفع جیسی مشہور و معروف شخصیت کے قتل کا معاملہ یقیناً سنگین اور اہم تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس معاملے میں ایک طرف بصرہ کا گورنر تھا تو دوسری طرف خلیفۂ وقت کے چچا تھے۔ مجبوراً یہ معاملہ بغداد میں خلیفۂ وقت کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں طرف کے گواہ اور صفائی پیش کرنے والے لوگوں کو خلیفہ نے اپنے دربار میں طلب کیا۔ مقدمہ خلیفہ کے دربار میں پیش ہوا۔ پھر اس کے بعد گواہی دینے والے لوگ سامنے آئے اور انھوں نے خلیفہ کے سامنے اپنا بیان دیا۔ اس کے بعد منصور نے اپنے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ سفیان کو ابن مقفع کے قتل کے جرم کی سزا میں ابھی قتل کردوں۔ لیکن آپ دونوں میں سے اس بات کی ذمہ داری لینے کے لئے کون آمادہ ہے کہ اگر سفیان کے قتل کے بعد ابن مقفع زندہ و سلامت دربار میں آگیا تو اس کو بھی سفیان کے خون کے قصاص میں اسی وقت قتل کر ڈالا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن مقفع زندہ و سلامت ہو اور میری پشت پر واقع دروازے سے ابھی ابھی اندر میں داخل ہو جائے۔"

عیسیٰ و سلیمان اس سوال کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے اور حیرت زدہ اپنی جگہ پر خاموشی کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ بہت ممکن ہے ابن مقفع زندہ ہو اور سفیان نے اسے زندہ و سلامت خلیفہ کے دربار میں بھیج دیا ہو۔ غرضکہ مجبوراً انھوں نے اپنا مقدمہ واپس لیا۔

اور اپنے گھر چلے گئے ۔ ایک طویل مدت گزر گئی مگر ابن مقنع کے بارے میں کہیں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ دھیرے دھیرے اس کی یاد بھی خاموش ہوتی چلی گئی ۔

ایک طویل مدت کے بعد یہ راز کھلا کہ ابن مقنع ہمیشہ اپنی زبان سے سفیان ابن معاویہ کو طرح طرح کی چوٹ پہونچایا کرتا تھا ۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک روز اس نے بہت سے لوگوں کے سامنے سفیان ابن معاویہ کو ماں کی گالی بھی دی ۔ چنانچہ سفیان ہمیشہ اس گھات میں لگا رہتا تھا کہ وہ ابن مقنع سے اس کی بدزبانی کا انتقام لے لیکن وہ خلیفہ وقت کے چچا عیسیٰ اور سلیمان کے خوف کی وجہ سے ابن مقنع کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا تا تھا کہ اسی اثنا میں ایک دوسرا حادثہ پیش آتا ہے ۔

دوسرا حادثہ یہ تھا کہ طے کیا گیا کہ منصور کے دوسرے چچا عبداللہ بن علی کے نام امان نامہ تحریر کیا جائے اور منصور سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس امان نامے پر دستخط کردے ۔ عبداللہ ابن علی نے اپنے بھائی عیسیٰ اور سلیمان کے دبیر ابن مقنع سے درخواست کی کہ وہ امان نامہ تیار کردے ابن مقنع نے درخواست قبول کرلی اور امان نامہ کی عبارت تیار کرتے وقت اس نے منصور کی ظالمانہ اور جلادانہ روش پر تنقید بھی کی ۔ جس وقت وہ امان نامہ منصور کو ملا وہ اسے پڑھ کر بہت متحیر اور سخت ناراض ہوا ۔ اس نے پوچھا " اس امان نامہ کی عبارت کس نے لکھی ہے ؟" لوگوں نے بتایا کہ یہ عبارت ابن مقنع نے ترتیب دی ہے ۔ چنانچہ خلیفہ منصور کے

دل میں بھی ابن مقفع کے خلاف وہی جذبات پیدا ہو گئے جو بصرہ کے گورنر سفیان ابن معاویہ کے تھے۔

خلیفہ منصور نے پوشیدہ طور پر سفیان ابن معاویہ کو لکھا کہ وہ ابن مقفع کی تنبیہ کرے۔ چنانچہ سفیان مناسب موقع کی تلاش کرنے لگا یہاں تک کہ ایک روز ابن مقفع اپنے کسی کام سے سفیان کے گھر پہونچ گیا۔ اس نے اپنے غلام اور گھوڑے کو گورنر کے دروازے پر ہی چھوڑ دیا وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو کیا دیکھا کہ سفیان اور اس کے جلاد صفت غلام ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے تنور روشن ہے جیسے ہی سفیان بن معاویہ کی نگاہ ابن مقفع پر پڑی اس کے دل میں لگی ہوئی بغض و کینہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے ابن مقفع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یاد ہے تونے مجھے فلاں روز ماں کی گالی دی تھی۔ اب میرے انتقام کا وقت آگیا ہے" ابن مقفع نے معذرت کرنی چاہی مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور ابن مقفع کو اسی جگہ نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔[۱]

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید بر نہج البلاغہ۔ مطبوعہ بیروت جلد ۴ ص ۲۸۹

۵۰

شمشیر زبان

عباسی دور کا مشہور ہجوگو شاعر علی ابن عباس معروف بہ ابن الرومی تیسری صدی ہجری کے دوران قاسم بن عبید اللہ المعتضد عباسی نامی وزیر کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنی شمشیر زبانی اور مخصوص قوت بیان پر ہمیشہ بڑا غرور رہا کرتا تھا۔ قاسم ابن عبید اللہ ابن الرومی کی شمشیر زبانی سے بہت خوفزدہ اور پریشان تھا۔ لیکن اپنی پریشانی اور ناراضگی کا اظہار نہ کرتا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ اس کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا اور اس کی زبان کے تیر و نشتر سے زخم کھانے کے بعد بھی وزیر کے اخلاق اور خوش سلوکی میں معمولی سی کمی نہ آتی تھی بلکہ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور باہم گفت و شنید میں بھی قطعی پرہیز نہ کرتا تھا۔ ایک بار قاسم نے چپکے سے یہ حکم دیا کہ ابن الرومی کی غذا میں زہر ملا دیا جائے۔ چنانچہ اس کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد ابن الرومی کو حقیقت کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور رکنے بڑھنے ہی والا تھا کہ قاسم نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"وہیں جہاں تو نے مجھے بھیجا ہے۔"

"پس میرے والدین کو میرا سلام پہونچا دینا۔"

"میں جہنم کے راستے سے نہیں جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہوئے ابن الرومی اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ گھر پہونچکر اس نے زہر کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے علاج شروع کر دیا لیکن اس علاج کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور آخر کار اپنی شمشیر زبان صفت کے ساتھ وہ اس دنیا سے چلا گیا۔[1]

---

[1] تتمۃ المنتھی۔ محدث قمی جلد ۲، ص ۴۰۰ و تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص ۴۴

(۵۱)

دوساتھی

ہشام بن الحکم اور عبد اللہ بن یزید اباضی کی مخلصانہ دوستی اور عدیم المثال ہمکاری پر کوفے والوں کو بڑا تعجب تھا۔ لوگ ان دونو آدمیوں کی دوستی کی مثال دیا کرتے تھے۔ دونوں نے مل کر سلائی کے سامان کی ایک دوکان کھول لی تھی اور مل جل کر دوکان چلا رہے تھے یہ لوگ جب تک زندہ رہے ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف یا جھگڑا نہیں ہوا۔

ان لوگوں کی دوستی کو جس چیز نے عوامی شہرت و مقبولیت عطا کرنے کے ساتھ ہی تعجب خیز بنا دیا تھا وہ یہ بات تھی کہ مذہبی عقاید کے اعتبار سے یہ دونوں دوست ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے اور دونوں اپنے اپنے مذہبی فرقے کے قطب شمار کئے جاتے تھے۔ ان میں سے ہشام مذہب شیعۂ امامیہ کے بلند مرتبہ علماء میں شمار کیا جاتا تھا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے خاص دوستوں میں سے تھا۔

اہلبیت کی امامت پر اس کا مکمل عقیدہ و ایمان تھا۔ لیکن عبداللہ بن یزید علمائے اباضیہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ جہاں تک مذہبی عقاید کا سوال تھا یہ دونوں دوست ایک دوسرے کے مخالف محاذ پر کھڑے نظر آتے تھے۔ لیکن ان لوگوں نے مذہبی تعصب کو زندگی کے دوسرے معاملات سے علیٰحدہ رکھا تھا اور نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ تجارتی کاروبار انجام دیا کرتے تھے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ہشام کے اکثر شیعہ دوست اسی دوکان پر آجایا کرتے تھے اور وہ ان لوگوں کو شیعی اصول و مسائل کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اور عبداللہ اپنے مذہبی عقائد کے خلاف باتیں سن کر قطعی ناراض نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ہشام کی نگاہوں کے سامنے عبداللہ اپنے ساتھیوں کو اباضی عقائد کی تعلیم دیا کرتا تھا جو شیعی عقائد سے مختلف ہوا کرتے تھے لیکن ہشام کے چہرے سے ناراضگی نہیں ظاہر ہوا کرتی تھی۔

ایک روز عبداللہ نے اپنے دوست ہشام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ ایک دوسرے کے مخلص دوست اور شریک کار ہیں۔

ے اباضیہ، خوارج کے چھ فرقوں میں ایک تھا جیسا کہ ہم لوگ جانتے ہیں کہ جنگ صفین کے دوران یہ گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ پہلے حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں تھے لیکن بعد میں ان لوگوں نے حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کر دی۔ خوارج ایک مخصوص عقیدے کے مطابق کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ لوگ انتہائی جاہل اور متعصب ہوا کرتے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ مسلمانوں کے درمیان ایک خطرناک جماعت کی حیثیت رکھتے ←

میں چاہتا ہوں کہ تو مجھے اپنا داماد بنا لے۔ اور اپنی لڑکی فاطمہ کی شادی میرے ساتھ کردے۔

ہشام نے عبداللہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے صرف ایک ہی جملہ کہا: "فاطمہ مومنہ ہے۔"

عبداللہ اپنے دوست کا یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا اور آئندہ کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

یہ واقعہ بھی ان دونوں کی دوستی میں خلل نہ پیدا کر سکا اور وہ لوگ پہلے کی طرح مل جل کر تجارتی کاروبار چلاتے رہے۔ صرف موت ہی ایسی چیز تھی جس نے ان دونوں مخلص ساتھیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ورنہ موت سے قبل یہ لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوئے اور تمام عمر ایک ساتھ کام کرتے رہے۔[۱]

ہی اور اس جماعت نے ہر دور کی حکومتوں کو بے شمار پریشانیوں سے دوچار کر رکھا تھا۔ خوارج حضرت علی اور عثمان پر تبرّا کرنے کے لیے متفق تھے۔ تمام وہ مسلمان جو ان کے عقیدے سے متفق نہ تھے وہ ان کی نظر میں کافر و مشرک سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے دیگر فرقوں میں شادی کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔ انھیں میراث نہیں دیتے تھے اور بنیادی طور پر غیر فرقے والوں کی جائداد اور خون کو مباح سمجھتے تھے۔ لیکن خوارج کے دیگر فرقوں میں فرقہ اباضیہ سب سے زیادہ متین اور معقول سمجھا جاتا تھا۔ یہ فرقہ دیگر مسلمانوں کے یہاں شادی کرنا جائز سمجھتا تھا اور مسلمانوں کی گواہی بھی قبول کر لیا کرتا تھا۔ اس فرقے کے لوگ دیگر مسلمان بھائیوں کے جان و مال کو محترم سمجھتے تھے۔ فرقہ اباضیہ کے صدر کا نام عبداللہ بن اباض تھا جس نے اموی دور حکومت کے آخری دنوں بغاوت کی تھی۔ ملاحظہ ہو "ملل و نحل" شہرستانی، جلد اول مطبوعہ مصر ص ۱۷۳ اور ص ۲۱۳

[۱] مروج الذہب مسعودی، مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۱۷۴ ذیل احوال عمر بن عبدالعزیز

(۵۲)

شرابی کی ہدایت

عباسی خلیفہ منصور کے حکم سے بیت المال کا دروازہ کھولا گیا اور مسلمانوں کو ان کا حق تسلیم کیا جانے لگا۔ سقرانی نامی ایک شخص بھی اپنا حصہ حاصل کرنے کے لئے بیت المال کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا لیکن اُسے کوئی پہچانتا نہ تھا اس وجہ سے وہ بیت المال سے اپنا حصہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ سقرانی کے اجداد میں ایک شخص کو رسول مقبولؐ نے آزاد کر دیا تھا چنانچہ وہ آزادی اسے میراث میں مل گئی اور لوگ اس کو "مولی رسول اللہ" یعنی آزاد شدہ رسول مقبول کی حیثیت سے پہچاننے لگے۔ اور یہ بات سقرانی کے لئے باعث فخر و افتخار قرار پائی۔ وہ اس شہرت کی وجہ سے خود کو خاندان رسالت سے منسوب کرنے لگا۔

بہرحال بیت المال سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے لئے سقرانی کی نگاہیں کسی ایک ایسے شخص کی تلاش کرنے لگیں جو اس کام میں اس کی مدد کرے اچانک اس کی نگاہ امام جعفر صادقؑ پر پڑی۔ چنانچہ وہ ان کے قریب گیا

اور اپنی حاجت بیان کی۔ امام نے فوراً ہی اس کا حصہ لاکر اسے دیدیا۔ سقرانی کو اس کا حصہ دیتے ہوئے امام نے نہایت شفقت آمیز انداز میں اس سے یہ جملہ ارشاد فرمایا: "اچھا کام اچھا ہی ہوتا ہے چاہے کسی نے بھی انجام دیا ہو۔ تجھ کو لوگ خاندان رسالت سے وابستہ جانتے ہیں اس لئے اگر کوئی نیک کام تو انجام دے تو اس کی خوبی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر کام برا ہے چاہے کسی نے بھی انجام دیا ہو لیکن خاندان رسالت سے تیری وابستگی کی وجہ سے اگر تو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کی خرابی اور برائی بڑھ جاتی ہے۔" یہ جملہ ختم ہوتے ہی امام جعفر صادقؑ وہاں سے چلے گئے۔

یہ جملہ سنتے ہی سقرانی کو اندازہ ہو گیا کہ امام جعفر صادقؑ اس کی شراب خوری کے راز سے بخوبی واقف ہیں۔ اور امامؑ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ غیر معمولی محبت اور نرمی کا سلوک اس لئے کیا ہے کہ سقرانی کو اس کے عیب کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ بہرحال سقرانی اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوا اور کافی دیر تک اپنے آپ کو لعنت و ملامت کرتا رہا۔[1]

---

[1] الانوار البہیۃ محدث قمی ص ۷۶ بہ نقل از ربیع الابرار زمخشری۔

(۵۳)

خلیفہ کا لباس

اپنے دور خلافت میں عمر بن عبد العزیز ایک دن منبر پر تقریر میں مشغول تھے۔ تقریر کے دوران منبر کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے دامن کو بار بار ہوا میں لہرا دیا کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجمع میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ بہت حیران ہوئے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے دل ہی میں سوال کرنا شروع کیا کہ "آخر کیا وجہ ہے کہ تقریر کے دوران خلیفہ اپنے دامن کو بار بار ہوا میں حرکت دے رہے ہیں۔"؟

تھوڑی دیر بعد تقریر ختم ہو گئی۔ اپنے گھروں کی طرف جانے سے قبل لوگوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ خلیفہ نے مسلمانوں کے بیت المال کی حفاظت اور اپنے بزرگوں کی فضول خرچی اور زیادتیوں کی تلافی کی خاطر اپنے لئے صرف ایک جوڑا کپڑا ہی منوار کھا ہے۔ چنانچہ ان کے پاس ایک جوڑا کپڑے کے علاوہ کوئی دوسرا لباس نہیں ہے، اور اس کپڑے کو تھوڑی دیر پہلے ہی دھویا تھا اور مجبوری کی وجہ سے

گیلا کپڑا پہن لیا لہذا تقریر کے دوران بار بار دامن ہلا کر وہ اپنے گیلے کپڑے کو سکھانے کی کوشش کرتے رہے تھے[1]

۱؎ مقدمہ ترجمۂ کتاب "نیایش" تالیف الکسس کارل بقلم آقای محمد تقی شریعتی۔

maablib.org

۵۴

پریشان حال نوجوان

رسول مقبولؐ نے لوگوں کے ساتھ نماز صبح مسجد میں ادا کی۔ موسم کچھ صاف ہو چکا تھا کہ لوگ اس روشنی میں ایک دوسرے کو بخوبی پہچان سکتے تھے۔ اسی اثنا میں رسول اکرمؐ کی نگاہ ایک ایسے نوجوان پر پڑی جس کی حالت غیر تھی اور اس کی گردن بار بار کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب لڑھک جایا کرتی تھی۔ انہوں نے اس نوجوان کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا ہے اور آنکھیں اندر کی طرف گھستی چلی جا رہی ہیں اور اس کا جسم بالکل ہی کمزور اور لاغر ہو چکا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اکرمؐ نے اس آشفتہ حال نوجوان سے پوچھا۔

"کیا حال ہے؟"

"یا رسول اللہ! میں حالت یقین میں ہوں۔"

"ہر یقین کی ایک علامت ہوا کرتی ہے جو اس کی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے۔ تیرے یقین کی علامت اور نشانی کیا ہے؟"

"میرے یقین کی علامت ہی نے تو میرا یہ حال کر رکھا ہے۔ اس علامت کی

وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آتی اور سارا دن میں عالم تشنگی میں بسر کیا کرتا ہوں۔ مختصر یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے دنیا کی تمام رعنائیوں سے منہ موڑ رکھا ہے اور ساری توجہ اپنے پروردگار کی طرف مبذول کر رکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرش پروردگار حساب کی منزل میں کھڑا ہے۔ اسی طرح میں تمام لوگوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ نیک لوگ بہشت میں آرام فرما ہیں اور برے لوگ دوزخ کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ میں بھڑکنے والی آگ کی آواز ابھی ابھی میرے کانوں میں آئی ہے۔"

رسول مقبولؐ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"یہ وہ بندۂ خدا ہے جس کے قلب کو پروردگار عالم نے نور ایمان سے روشن کر دیا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اس جوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اپنی اس نیک حالت کو برقرار رکھنا۔"

اس جوان نے رسول مقبولؐ سے درخواست کی: "یا رسول اللہ! آپ دعا کریں کہ پروردگار مجھے جہاد میں شرکت کی توفیق اور شہادت کا شرف عطا فرمائے۔" رسول اکرمؐ نے اس کی خواہش کے مطابق بارگاہ عالیہ میں دعا کر دی۔ کچھ ہی دنوں بعد جہاد کا موقع آگیا اس نوجوان نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ اس میں شرکت کی اور اس جنگ کے دوران شہادت سے ہم آغوش ہونے والوں میں سے دسواں آدمی کوئی اور نہیں بلکہ وہی نوجوان تھا۔[1]

[1] کافی جلد دوم: باب حقیقۃ الایمان والیقین ص ۵۳

(۵۵)

حبشہ کے مہاجرین

شہر مکہ میں ہر سال مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اہل مکہ گوناگون اذیت اور مصائب کے ذریعہ بھی اسلام کے گرویدہ لوگوں کو مسلمان ہونے سے نہ روک سکے۔ ان لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ لوگ اسلام سے روگردانی اختیار کریں مگر انھیں کامیابی نہ مل سکی اور امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح لوگ فوج در فوج اسلام کے دامن میں پناہ لیتے رہے اور بڑی سے بڑی اذیت بھی ان لوگوں کو اسلام سے علیحدہ نہ کرسکی۔ اسلام کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی قریش کو بالکل اچھی نہ لگی بلکہ وہ مذہب اسلام کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے اور زیادہ ناراض اور غضبناک رہنے لگے اور انھوں نے مسلمانوں پر کی جانے والی سختیوں اور اذیتوں میں اور اضافہ کردیا۔

مسلمانوں کا زندگی بسر کرنا دوبھر تھا مگر صبر کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ رسولؐ مقبول نے قریش کے مصائب سے مسلمانوں کو وقتی طور پر محفوظ رکھنے کے لئے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ لوگ

مکّہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اس وقت حبشہ کا حاکم ایک عادل اور انصاف پسند آدمی ہے۔ لہٰذا تم لوگ اس کی حکومت میں کچھ دنوں تک نہایت آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہو، انشاء اللہ تھوڑے دنوں بعد سبھی مسلمانوں کیلئے حالات سازگار ہو جائیں گے۔

غرضیکہ بہت سے مسلمان مکّہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے اور وہاں نہایت آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ مکّہ میں یہ لوگ اپنے مذہبی فرائض آزادی کے ساتھ نہیں ادا کر سکتے تھے لیکن حبشہ میں انھیں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ نہایت آزادی اور اطمینان کے ساتھ اسلامی فرائض انجام دینے لگے۔

کچھ دنوں بعد قبیلۂ قریش کو یہ اطلاع ملی کہ مکّہ سے مہاجرت کرنے والے مسلمان حبشہ میں نہایت آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ کہیں حبشہ میں کوئی اسلامی تنظیم تشکیل نہ پا جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے جس کی مدد سے تمام مسلمان دوبارہ مکّہ واپس آجائیں اور انھیں پھر مصائب و پریشانیوں کا شکار بنا لیا جائے۔ اس مقصد کیلئے ان لوگوں نے دو سمجھدار اور چالاک آدمیوں کو منتخب کیا اور ان کے ہمراہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے دربار کے لوگوں کے لئے بے شمار قیمتی تحفے بھی روانہ کر دیے تاکہ وہ لوگ حبشہ جا کر بادشاہ اور اس کے

درباریوں سے اس سلسلے میں گفتگو کریں۔ چلتے وقت ان دونوں کو ہدایت کردی گئی کہ حبشہ پہونچکر پہلے ان با اثر درباری افسران سے ملاقات کریں جن کی بات نجاشی بادشاہ کے اوپر اثر کرسکے۔ افسروں کو تحفہ دینے کے بعد ان سے کہیں کہ " ہمارے کچھ نادان اور ناتجربہ کار نوجوان اپنے دین سے علیحدہ ہوگئے ہیں اور ان لوگوں نے تمہارا مذہب بھی قبول نہیں کیا اور اپنے وطن سے بھاگ کر تمہارے ملک میں پناہ گزین ہوگئے ہیں۔ ہماری قوم کے بزرگوں نے ہمیں آپ لوگوں کی خدمت میں بھیجا ہے کہ ہم آپ سے یہ درخواست کریں کہ ان نوجوانوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیں تاکہ وہ دوبارہ ہماری قوم میں شامل ہوجائیں۔ لہذا آپ لوگوں سے التماس ہے کہ جب ہم لوگ بادشاہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کریں تو آپ لوگ ہمارے خیال کی تائید کیجئے گا۔"

غرضکہ قریش کے یہ دونوں چالاک اور سمجھدار لوگ وہاں پہونچ گئے اور دربار کے با اثر افسروں سے ملاقات کی اور انکی خدمت میں قیمتی تحفہ پیش کرنے کے بعد اپنا معروضہ پیش کیا۔ سب لوگوں نے یہ وعدہ کرلیا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ان کے بیان کی تائید کریں گے۔

اس کے بعد ایک دن یہ لوگ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں داخل ہوئے عمدہ اور نفیس قسم کے تحفے پیش کرنے کے بعد ان لوگوں نے بادشاہ کے سامنے اپنی حاجت بیان کردی۔

بات تو پہلے ہی طے کی جاچکی تھی چنانچہ شاہی دربار کے سبھی اعلیٰ

افسروں نے قریش کے نمائندوں کی حمایت شروع کردی اور سب نے متفقہ طور پر بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ ان مسلمانوں کے اخراج کا حکم جلد از جلد صادر کر دینا چاہیے تاکہ وہ لوگ فوراً مکہ واپس چلے جائیں۔

لیکن نجاشی اپنے دربار کے لوگوں کی رائے سے قطعی متفق نہ ہوا اور کہنے لگا: "کچھ لوگوں نے اپنا وطن چھوڑ کر ہمارے ملک میں پناہ لی ہے۔ یہ قطعی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں معاملات کی تحقیق کے بغیر ان لوگوں کی ناموجودگی میں ان کے خلاف حکم صادر کردوں کہ ہمارے ملک سے فوراً باہر نکل جائیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو دربار میں پیش کیا جائے تاکہ میں ان کی بات بھی سنوں اور اس کے بعد یہ فیصلہ کروں کہ کیا کرنا چاہیے؟"

بادشاہ نجاشی کا آخری جملہ سنتے ہی قریش کے نمائندوں کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور ان کے دل کی دھڑکن بھی کافی تیز ہو گئی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو بادشاہ کے سامنے بیان دینے کا موقع ملے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چاہے مسلمانوں کو واپس نہ کیا جائے لیکن انھیں دربار تک پہونچنے کا موقع نہ دیا جائے۔ کیونکہ اس نئے مذہب میں جو کچھ بھی خوبی ہے وہ "سخن" اور "کلام" کی وجہ سے ہے۔ محمدؐ کے منہ سے نکلنے والے مخصوص کلمات ہی کی وجہ سے لوگ اس مذہب کے دیوانے ہو گئے ہیں۔ محمدؐ کا کہنا ہے خدا کی طرف سے میرے اوپر وحی نازل ہوئی ہے؟ کیا ان کی سحر آمیز باتوں میں جاذبیت پوشیدہ نہیں ہے؟

اب کون جانتا ہے کہ کیا ہوگا؟ بہت ممکن ہے کہ وہ دربار میں آکر وہی باتیں کہنے لگیں جو انھوں نے محمد سے سنی ہے اور انھیں زبانی یاد بھی ہے اور ان کی باتیں شاہی دربار پر بھی اسی طرح اثر کر جائیں جیسے مکہ والوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ بات ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ غرضکہ بادشاہ نے حکم صادر کر دیا کہ حبشہ میں پناہ لینے والے نوجوانوں کو وقت معینہ پر دربار میں پیش کر دیا جائے۔

مسلمانوں کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ قریش کے نمائندے حبشہ کے اعلیٰ درباری افسروں سے ملاقات کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی پتہ تھا کہ ان نمائندوں کا حبشہ آنے کا اصل مقصد کیا ہے۔ غرضکہ وہ لوگ کافی پریشان تھے اور بار بار یہی سوچ رہے تھے کہ اگر یہ لوگ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں حبشہ سے باہر نکال دیا جائے گا اور ہم پھر مکے واپس لوٹنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔

ایک روز شاہی دربار کا ایک سپاہی ان لوگوں کے پاس پہونچ گیا اور بادشاہ نجاشی کا حکم ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا تم لوگوں کو فلاں تاریخ کو شاہی دربار میں حاضر ہونا ہے۔ بادشاہ کا یہ حکم ان کے لئے اہم خطرے کی علامت بن گیا۔ وہ سوچنے لگے کہ ہمیں مکہ جاکر دوبارہ انھیں مصائب اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا چنانچہ ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کرنا شروع کیا کہ بادشاہ کے دربار میں کیا بیان دیا جائے؟ سب لوگوں نے متفقہ طور پر یہی خیال ظاہر کیا کہ

بادشاہ کے دربار میں حقیقت کے علاوہ اور کوئی بات نہ کہی جائے یعنی پہلے دور جاہلیت کے حالات پر روشنی ڈالی جائے پھر اس کے بعد اسلام کی خوبیاں اس کے احکام اور دعوت اسلامی میں موجود روحانی جاذبیت کا تذکرہ کیا جائے اور خلاف واقعہ نہ کوئی بات کہی جائے اور نہ ہی کسی حق بات کو پوشیدہ رکھا جائے۔

بہرحال اس فیصلے اور ارادے کے ساتھ یہ لوگ بادشاہ کے دربار میں داخل ہو گئے۔ چونکہ ایک نئے مذہب کی تحقیق کا معاملہ درپیش تھا لہذا نجاشی بادشاہ نے اپنے ملک کے سرکاری مذہب مسیحی کے نامور علماء کو بھی دربار میں بلا رکھا تھا۔ ان عیسائی علماء کے سامنے ایک ایک کتاب مقدس رکھی ہوئی تھی۔ دربار کے اعلیٰ افسران بھی اپنی اپنی جگہ تشریف فرما تھے۔ شاہی شان و شوکت کے درمیان بلند مرتبہ عیسائی علماء کی موجودگی نے دربار کی شان و شوکت کو دوبالا کر رکھا تھا۔ خود بادشاہ نجاشی صدر مجلس کی جگہ پر جلوہ افروز تھا۔ اور دوسرے تمام لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار کی غیر معمولی شان و شوکت ہر دیکھنے والے کو شرم سے اپنی گردن جھکانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

اسلام پر خالص اعتقاد اور مکمل ایمان نے مسلمانوں کو ایک مخصوص وقار، متانت اور سنجیدگی عطا کر رکھی تھی چنانچہ وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہوئے اور نہایت اطمینان، سکون اور وقار کے ساتھ اس باعظمت مجلس میں داخل ہو گئے۔ جعفر ابن ابی طالب سب سے آگے تھے اور

سارے مسلمان ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے دربار میں داخل ہوتے گئے۔ یہ لوگ دربار میں داخل ہوتے وقت اپنے چہرے اور نقل و حرکت سے ایسا تاثر پیش کر رہے تھے گویا دربار کی ظاہری سجاوٹ اور غیر معمولی شان و شوکت سے وہ قطعی مرعوب نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دربار میں داخل ہوتے وقت شاہی دربار کے ان آداب اور طرزِ انکساری کو بھی اختیار نہیں کیا جس کے تحت دربار میں داخل ہونے والا ہر شخص اپنی انکساری کے اظہار کے لئے دربار کی زمین کو بوسہ دیا کرتا ہے۔ یہ لوگ نہایت سادگی کے ساتھ دربار کے اندر تشریف لے گئے اور اسلامی طرزِ ملاقات کو مدنظر رکھتے ہوئے بادشاہ کو سلام کیا۔

مسلمانوں کی حرکت کو شاہی دربار کی توہین کا نام دیتے ہوئے لوگوں نے اعتراض کیا تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: "ہمارا دین جس کی خاطر ہم لوگوں نے اس جگہ پناہ لی ہے، ہمیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی غیر خدا کے سامنے خاکساری کا اظہار کیا جائے۔"

غرضیکہ مسلمانوں کے اس جواب سے شاہی دربار میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ان کا رعب طاری ہوگیا اور مسلمانوں کی عجیب و غریب شخصیت اور غیر معمولی عظمت و بزرگی کے سامنے شاہی دربار کی ظاہری شان و شوکت اور تمام آرائش و زیبائش ماند پڑ گئی۔

بہرحال خود بادشاہ نجاشی نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے

پوچھا: "آخر تم لوگوں کا یہ کون سا نیا مذہب ہے۔ جو ہمارے دین اور تمھارے سابق دین سے بھی زیادہ اچھا اور بالکل علیحدہ ہے۔؟"

حبشہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بڑے بھائی جعفر ابن ابیطالب مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے اور یہ طے ہوا تھا کہ شاہی دربار میں کئے جانے والے سوالوں کا جواب وہی دیں گے۔

جعفر نے بادشاہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "دراصل ہم لوگ نادانی اور جہالت کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھایا کرتے تھے، فحش حرکتیں کیا کرتے تھے، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے اور ہمارے معاشرے کے طاقتور لوگ کمزور اور پسماندہ لوگوں کو نگلتے جا رہے تھے۔ ہمارے ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے خداوند عالم نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر بھیج دیا جس کی پاکدامنی اور نسبی پاکیزگی کے بارے میں ہم لوگوں کو ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ اس پیغمبر خدا نے ہم لوگوں کو توحید کی طرف دعوت اور ایک خدا کی عبادت کا درس دیا اور بتوں، پتھروں اور لکڑیوں کی پرستش سے منع کیا اس نے ہمیں سچ بولنے کا حکم دیا اور لوگوں کی امانت ادا کرنے اور پڑوسیوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا درس دیا۔ اس نے ہم مسلمانوں کو لوگوں کا احترام کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ اس پیغمبر نے ہم لوگوں کو دروغ گوئی، پاکدامن خواتین پر اتہام لگانے اور یتیم کا مال کھانے سے روکا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ عبادت پروردگار میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اللہ کے پیغمبر نے ہی ہمیں

نماز، روزہ، حج اور زکواۃ وغیرہ کی تعلیم بھی دی۔

چنانچہ ہم سب لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کی رسالت کی گواہی بھی دی۔ اور ان اسلامی احکام اور اس کی گران قدر تعلیمات پر عمل کرنا شروع کر دیا جن کا ذکر ابھی میں نے کیا۔ لیکن ہماری قوم نے ہم لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر اعتراض کیا اور ہمارے اوپر طرح طرح کے مصائب ڈھانے لگے تاکہ ہم لوگ اس الٰہی مذہب کو چھوڑ کر پھر اپنے سابقہ مذہب کی طرف لوٹ جائیں جو گوناگوں خرابیوں کے مجموعے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے دوبارہ بت پرستی اور دیگر ذلیل حرکتوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم لوگوں کے اس انکار پر قوم والوں نے ہم پر کی جانے والی سختیوں اور اذیتوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ جس سے تنگ آ کر ہم لوگوں نے اپنا وطن چھوڑ کر آپ کے ملک میں پناہ لی تاکہ پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع مل جائے۔"

جعفر ابن ابیطالب نے ابھی اپنا آخری جملہ پورا ہی کیا تھا کہ نجاشی نے کہا :۔ "وہ کلمات جس کو تمہارے پیغمبر وحی الٰہی کہتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوتے ہیں، کیا تمہیں اس کا کوئی حصہ یاد ہے ؟"

جعفر ابن ابیطالب :۔ "جی ہاں"

بادشاہ نجاشی :۔ "اچھا تو کچھ سناؤ۔"

جعفر نے دربار کے ماحول پر اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پورا دربار

عیسائی مذہب کے ماننے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ بادشاہ خود بھی عیسائی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور صدر مجلس میں بیٹھے ہوئے بزرگ پادریوں کے سامنے کتاب مقدس انجیل کھلی ہوئی رکھی تھی۔ غرضکہ پورے ماحول پر عیسائیت چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ مصلحت وقت کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کر دی۔ اور اس سورۂ مبارکہ کی ان آیتوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ پڑھنے لگے، جو عیسیٰ و مریم اور یحییٰ و زکریا سے مربوط ہیں۔ جعفر کے مخصوص انداز تلاوت قرآن نے شاہی دربار کو غیر معمولی طور پر متاثر کر رکھا تھا۔ وہ ان آیات کی تلاوت کے ذریعہ حضرت عیسیٰ و جناب مریم کے سلسلے میں قرآن مجید کے صحیح اور معتدل منطق کو عیسائیوں کے سامنے بیان کر دینا چاہتے تھے۔ اور انھیں یہ سمجھا دینا چاہتے تھے کہ قرآن مجید عیسیٰ و مریم کو انتہائی تقدس کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے بھی انھیں الٰہی حدود سے دور رکھتا ہے۔ ان آیات کی تلاوت کے ساتھ ہی محفل کا رنگ بدل گیا اور سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بادشاہ نجاشی کہنے لگا۔ "خدا کی قسم حضرت عیسیٰ نے جن حقائق کا تذکرہ کیا تھا وہ یہی ہیں اور حضرت عیسیٰ کے کلام اور ان قرآنی آیات کی بنیاد ایک ہے۔"

پھر بادشاہ نجاشی نمائندگان قریش سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: "تم لوگ سیدھے اپنے ملک واپس چلے جاؤ۔ جو تحفہ وغیرہ ساتھ

لائے تھے اسے بھی واپس لیتے جانا۔

کچھ ہی دنوں بعد نجاشی نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔ اس نے نویں ہجری میں وفات پائی اور رسول مقبول نے دور ہی سے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔[۱]

۱؎ سیرۂ ابن ہشام جلد ۱، ص ۲۲۱، ۳۲۸ اور شرح ابن ابی الحدید بر نہج البلاغہ جلد ۴، مطبوعہ بیروت ص ۱۷۵، ۱۷۷ و ناسخ التواریخ وقایع قبل از ہجرت۔

(۵۶)

مزدور اور آفتاب

مزدوروں کا لباس پہنے ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں بیلچہ سنبھالے ہوئے امام جعفر صادق اپنے باغ کے کاموں میں پوری طرح سرگرم تھے ۔ زیادہ دیر تک کام کرنے کی وجہ سے ان کا تمام جسم پسینے سے تربتر تھا۔

اسی اثنا میں ابو عمرو شیبانی اس جگہ آگئے اور دیکھا کہ امام کے جسم سے پسینہ ٹپک رہا ہے انھوں نے سوچا شاید مزدور نہ ہونے کی وجہ سے امام نے باغ کا کام خود کرنا شروع کر دیا ہے ۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور عرض کیا ۔ " یہ بیلچہ مجھے دیدیجئے باقی کام میں کردوں گا ۔"

امام نے فرمایا : " نہیں ، دراصل میں اس چیز کو بہت پسند کرتا ہوں کہ انسان روزی حاصل کرنے کے لئے خود تکلیف اٹھائے اور کسب معاش کے سلسلے میں دھوپ کی شدت برداشت کرے ۔"[1]

---

[1] " انی احب ان یتاذی الرجل بحر الشمس فی طلب المعیشۃ "

بحار الانوار جلد ۱۱ ، ص ۱۳۰

۵۷

نیا پڑوسی

ایک انصاری نے مدینے میں ایک نیا گھر خریدا اور فوراً ہی نئے گھر میں منتقل ہو گیا تھوڑے ہی دنوں بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ نہایت نامناسب پڑوسی سے پالا پڑ گیا ہے۔

چنانچہ وہ رسول مقبولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "یا رسول اللہ! میں نے فلاں محلّے میں فلاں قبیلے کے درمیان ایک مکان خرید لیا ہے اور وہیں منتقل ہو گیا ہوں۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرا قریب ترین پڑوسی صرف نامعقول آدمی ہی نہیں ہے، بلکہ نہایت شریر اور فساد پسند ہے اور میں اپنے آپ کو اس کے شر و فساد سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اور مجھے قطعی اطمینان نہیں ہے کہ میرے لئے پریشانی اور نقصانات کے اسباب فراہم نہیں کرے گا۔"

رسول مقبولؐ نے علیؑ، سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ جیسے چار آدمیوں کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ مسجد میں تمام مردوں اور عورتوں کے

درمیان نہایت بلند آواز میں لوگوں تک یہ پیغام پہونچا دیں کہ جس شخص کی مردم آزاری اور شر پسند اخلاق کی وجہ سے اس کا پڑوسی نالاں اور پریشان ہو وہ ایمان والا یعنی مومن نہیں ہے۔"

حکم رسول کے مطابق یہ عام اعلان تین مرتبہ کیا گیا اس کے بعد رسول اکرم نے ہر چہار جانب اپنا ہاتھ گھماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔"

"چاروں طرف چالیس گھر کے لوگ پڑوسی شمار ہوتے ہیں۔"[1]

---

[1] کافی جلد ۲، باب حق الجوار ص ۶۶۶

(۵۸)

آخری کلام

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی والدہ ام حمیدہ اپنے شوہر بزرگوار امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد انتہائی رنج وغم کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک ان کی نگاہ ابو بصیر پر پڑی جو وفات امام کے سلسلے میں تعزیت وتسلیت پیش کرنے آئے تھے۔ ابو بصیر کو دیکھتے ہی ام حمیدہ کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ ابو بصیر بھی امام کے غم میں کچھ دیر تک روتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہی ام حمیدہ نے ابو بصیر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "تم اس وقت موجود نہ تھے جب امام عالم احتضار میں تھے۔ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔"

ابو بصیر نے حیرت بھری نگاہوں سے ام حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "آخر کیا واقعہ تھا۔ مجھے بھی بتلایئے؟"

انھوں نے کہا: "امام کی زندگی کے آخری لمحات تھے اور وہ آنکھ بند کئے ہوئے اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے۔ اچانک امام

نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے۔ "میرے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور چاہنے والوں کو فوراً میرے قریب بلاؤ۔"

یہ ایک حیرت ناک بات تھی۔ امام نے اپنی زندگی کی آخری خواہش اس انداز میں بیان کی تھی گویا وہ کوئی حکم صادر فرما رہے ہیں۔ بہرصورت تمام لوگوں کو جمع کیا گیا اور حتی الامکان یہ کوشش کی گئی کہ امام کے عزیزوں، رشتہ داروں اور چاہنے والوں میں کوئی باقی نہ رہنے پائے۔ سب لوگ امام کے قریب اس انتظار میں کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں امام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ سب لوگوں کو اپنے قریب اکٹھا دیکھتے ہی امام نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ہماری شفاعت ان لوگوں کو ہرگز نہ حاصل ہو گی جو نماز کو سبک شمار کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱، ص ۱۰۵

(۵۹)

نسیبہ

نسیبہ بنت کعب اپنے لڑکے عمارہ کی وجہ سے ام عمارہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کے کندھے پر ایک ایسا نشان تھا جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوتی تھی کہ یہ کسی گہرے زخم کا داغ ہے۔ خواتین اور خصوصاً وہ نوجوان لڑکیاں جنھوں نے رسول مقبول کا زمانہ نہ دیکھا تھا، یا جو عہد رسولؐ میں بہت کم سن تھیں، ام عمارہ کے کندھے پر گہرے زخم کا نشان دیکھ کر اس ہولناک واقعہ کے بارے میں پوچھنے لگتی تھیں جس کی وجہ سے ام عمارہ کو شدید زخم لگا تھا۔ اور ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی اس جنگ "احد" کی داستان کو ام عمارہ کی زبان سے سنیں جس کے دوران انھیں یہ صدمۂ جانکاہ برداشت کرنا پڑا تھا۔

ام عمارہ کو اس بات کی قطعی فکر و پروا نہ تھی کہ اس کا شوہر اور دونوں لڑکے میدان احد میں دشمنان اسلام کا مقابلہ کرتے ہوئے

رسولؐ مقبول کی حفاظت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ وہ تو اپنے کندھوں پر مشکیزہ اٹھائے ہوئے زخمی سپاہیان اسلام کو پانی پلاتے اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سپاہیان اسلام کا زخم باندھنے کیلئے وہ اپنے ہمراہ کپڑے کی کچھ پٹیاں بھی لئے ہوئے تھی۔ اس کے علاوہ اس دن نسیبہ کے پاس اور کوئی کام نہ تھا۔

جنگ کے آغاز میں افراد کی قلت اور اسلحوں کی کمی کے باوجود سپاہیان اسلام نے دشمن کو ایک بڑی شکست سے دوچار کر رکھا تھا۔ اور فوج دشمن کے لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد عینین پہاڑی پر موجود نگہبانوں کی معمولی سی غفلت کی وجہ سے دشمن کی فوج پیچھے کی جانب سے لشکر اسلام پر ٹوٹ پڑی۔ حالات بدل گئے اور رسول مقبول کے قریب جمع سپاہیان اسلام چاروں طرف پراگندہ ہو گئے۔

نسیبہ نے جب یہ حالات دیکھے تو پانی کی مشک زمین پر رکھ دی اور اپنے ہاتھوں میں تلوار اٹھالی۔ کبھی وہ تیر کمان سے کام لیتی تھی اور کبھی تلوار کے سہارے دشمن کی فوج پر حملہ کرتی تھی۔ میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے ایک سپاہی کی زرہ چھین لی اور دشمن کا مقابلہ کرتے وقت اس زرہ سے بھی کام لینے لگی۔ اچانک میدان جنگ میں یہ آواز ابھری۔ "خود محمدؐ کہاں ہے"؟ خود محمدؐ کہاں ہے؟" یہ سنتے ہی نسیبہ اس طرف تیزی سے دوڑ پڑی جدھر سے یہ آواز آرہی تھی۔ اور وہاں پہونچے

ہی اس نے اس دشمن سپاہی پر دو تین گہرے وار کردیئے جو یہ نعرہ بلند کررہا تھا۔ چونکہ وہ سپاہی دو زرہ پہنے ہوئے تھا، اس وجہ سے نسیبہ کے وار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن اس سپاہی نے نسیبہ کے بے دفاع کندھے پر ایک بھرپور وار کردیا جس کی وجہ سے نسیبہ کا شانہ ایسا زخمی ہوگیا کہ سال بھر سے زیادہ عرصے تک اس کا علاج لازمی تھا۔ رسولؐ مقبول نے دیکھ لیا کہ نسیبہ کے زخم سے خون کا فوارہ ابل رہا ہے، انھوں نے نسیبہ کے ایک لڑکے کو آواز دیتے ہوئے فرمایا "دوڑ اور اپنی ماں کے زخم پر پٹی باندھ دے۔" چنانچہ لڑکے نے والدہ کے گہرے زخم پر مضبوط پٹی باندھ دی اور نسیبہ پھر کارزار میں ہمہ تن سرگرم ہوگئی۔

اسی اثنا میں نسیبہ نے دیکھا کہ اس کے ایک فرزند کو چوٹ لگ گئی۔ اس نے فوراً ہی وہ پٹیاں نکال لیں جو سپاہیان اسلام کے زخم پر باندھنے کے لئے اپنے ہمراہ لائی تھی۔ اور تیزی سے اپنے زخمی لڑکے کے پاس پہونچ کر اس کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ رسولؐ اکرم اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور اس خاتون کی بہادری دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اپنے لڑکے کے زخم پر پٹی باندھنے کے بعد نسیبہ اس سے کہنے لگی: "میرے بیٹے! دشمنان اسلام سے جنگ کے لئے فوراً آمادہ ہوجا۔" ابھی نسیبہ اپنا یہ جملہ پورا بھی نہ کرنے پائی تھی کہ رسولؐ اکرم نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نسیبہ سے کہا:

تیرے لڑکے کو زخمی کرنے والا شخص یہی ہے۔ یہ سنتے ہی نسیبہ شیر کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی اور اس کی پنڈلیوں پر ایسی تلوار لگائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا۔ "نسیبہ تو نے اپنا انتقام لیا۔ خدا کا شکر کہ تجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ اور اس نے تجھے عزت و سرخ روئی عطا کر دی۔"

اس جنگ کے دوران کچھ مسلمان سپاہی شہید اور کچھ زخمی ہو گئے۔ نسیبہ بھی بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

واقعہ احد کے بعد رسول مقبولؐ نے سپاہیان اسلام کو "حمراء الاسد" کی طرف حرکت کا حکم صادر کیا چنانچہ لشکر اسلام حمراء الاسد کی طرف چل پڑا۔ نسیبہ بھی لشکر کے ساتھ حرکت کرنا چاہتی تھی مگر گہرے اور سنگین زخم کی وجہ سے اس کے اندر آگے بڑھنے کی طاقت نہ تھی۔ "حمراء الاسد" سے واپسی کے فوراً بعد ہی رسول مقبولؐ نے ایک شخص کو نسیبہ کی مزاج پرسی کے لئے اس کے پاس بھیجا۔ اس نے واپس آکر نسیبہ کی سلامتی کی اطلاع دی۔ رسول خداؐ یہ خبر سن کر بہت خوش ہو گئے۔[1]

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۳، ص ۲۶۸ – ۲۷۰ نقل از مغازی واقدی

(۶۰)

خواہشِ مسیحؑ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حوارین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میری ایک خواہش و حاجت ہے اگر تم لوگ میری اس خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ کرو تو میں اسے بیان کردوں۔" حوارین نے جواب دیتے ہوئے کہا: "آپ حکم دیں ہم سبھی لوگ اس کی تعمیل و اطاعت کے لئے حاضر ہیں۔"

حضرت عیسیٰ اپنی جگہ سے اٹھے اور حوارین میں ہر ایک کا پیر دھونا شروع کر دیا۔ حوارین کے چہروں پر بے چینی اور ناراحتی کے آثار نمایاں ہو گئے مگر چونکہ حضرت عیسیٰ کی خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ کر چکے تھے لہذا خاموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا۔ بہر حال عیسیٰؑ اپنے حوارین کا پیر دھوتے رہے۔ اور جب انھیں اس کام سے فرصت ملی تو حوارین ان سے کہنے لگے: "آپ ہم لوگوں کے معلم ہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ ہم لوگ آپ کے پیر دھوتے مگر آپ نے تو ہم لوگوں کے

پیر دھو کر ہمیں شرمندہ کر دیا۔"

حضرت عیسٰی نے جواب دیا۔" میں نے یہ کام تم لوگوں کو سمجھانے کے لئے انجام دیا ہے کہ سب سے زیادہ لائق اور عالم وہ ہے جو خدمت خلق کی ذمہ داریاں سنبھال لے۔ میں نے یہ کام تواضع اور انکساری کا نمونہ پیش کرنے کے لئے انجام دیا ہے تاکہ تم لوگ تواضع اور انکساری کا درس حاصل کر سکو اور میرے بعد جب عوام الناس کی تعلیم اور دنیا میں تبلیغ حق کی ذمہ داریاں تمہارے اوپر آجائیں تو تم لوگ بھی تواضع وانکساری کے ساتھ خدمت خلق کی روش اختیار کر سکو۔ عقل و حکمت خاکساری اور تواضع کی زمین پروان چڑھا کرتی ہے۔ اس کے برعکس تکبر اور غرور کے ماحول میں عقل و حکمت کا پھلنا پھولنا قطعی ناممکن ہے، بس اس کی مثال یہ سمجھ لو کہ گھاس نرم زمین میں اگا کرتی ہے، سخت زمین اور پہاڑوں پر گھاس کا نکلنا ممکن ہی نہیں ہے[1]۔"

---

[1] وسائل جلد ۲، ص ۴۵۷

(٦١)

صحرا میں لکڑیوں کی فراہمی

رسولؐ مقبول نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک مسافرت کے دوران ایسی سرزمین پر پڑاؤ ڈال دیا جو بالکل خالی اور ویران تھی ان لوگوں کو آگ جلانے کے لئے لکڑی کی ضرورت پڑی۔ رسولؐ اکرم نے فرمایا: "سب لوگ مل جل کر لکڑیاں اکٹھا کرو۔" ان لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ یہ سرزمین بالکل خالی اور ویران پڑی ہوئی ہے۔ اور دور دور تک لکڑی کا کوئی ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "بہرحال ہر آدمی جتنی لکڑی جمع کرسکتا ہے جمع کرے۔"

اصحاب جنگل کی طرف چل پڑے اور راستے میں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اگر ان لوگوں کی نظر کسی چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے پر بھی پڑ جاتی تو اسے فوراً ہی اٹھا لیتے تھے۔ غرض کہ ہر شخص تھوڑی تھوڑی لکڑی لئے ہوئے واپس لوٹا اور جب سب لوگوں

کی جمع کی ہوئی لکڑیوں کو اکٹھا کیا گیا تو لکڑی کا اچھا خاصہ ڈھیر جمع ہو گیا
یہ دیکھ کر رسول مقبولؐ نے ارشاد فرمایا: "ہمارے چھوٹے اور معمولی
گناہوں کی مثال بھی لکڑی کے ان چھوٹے ٹکڑوں جیسی ہے جو ابتدا
میں بالکل نظر ہی نہیں آتے۔ لیکن ہر چیز کا کوئی نہ کوئی تلاش کرنے
والا ہوا کرتا ہے۔ تم لوگوں نے تلاش شروع کی تو لکڑیوں کا یہ ڈھیر جمع
ہو گیا۔ بالکل اسی طرح تمہارے چھوٹے چھوٹے اور معمولی گناہوں کو
بھی جمع کیا جا رہا ہے۔ اور ایک دن تم لوگ دیکھو گے کہ بظاہر چھوٹے
اور نہ دکھائی دینے والے گناہوں کی کثرت ایک بڑے بوجھ کی شکل
اختیار کر چکی ہے[1]۔"

---

[1] وسائل، جلد ۲، ص ۳۶۲

(٦٢)

دسترخوان پر شراب

عباسی خلیفہ منصور دوانیقی تھوڑے وقفے کے بعد مختلف بہانوں سے امام جعفر صادقؑ کو مدینے سے عراق بلالیا کرتا تھا۔ اس کا اصل مقصد امام کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنا تھا۔ اور کبھی کبھی تو وہ امام کو کافی دنوں تک مدینہ لوٹنے نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ عراق میں موجود تھے کہ منصور کی فوج کے ایک افسر نے اپنے لڑکے کا ختنہ کیا۔ اس موقع پر اس فوجی افسر نے ایک مفصل ولیمہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ مرتبہ افسران اور دیگر اعیان مملکت اس تقریب میں شامل تھے۔ دیگر مدعوئین کی طرح اس فوجی افسر نے امام جعفر صادقؑ کو بھی دعوت دے رکھی تھی۔ دسترخوان لگا دیا گیا اور تمام مہمان کھانا کھانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ کھانا لایا گیا اور سب لوگ کھانے میں مشغول ہو گئے۔ اسی اثنا میں ایک مہمان نے پانی طلب کیا۔ چنانچہ پانی کی جگہ اس کے ہاتھوں میں شراب کا پیالہ پکڑا دیا گیا۔ جیسے ہی اس شخص کو

شراب کا پیالہ دیا گیا امام جعفر صادقؑ دسترخوان چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فوراً ہی اس جگہ سے باہر نکل آئے۔ ان لوگوں نے امام کو دسترخوان پر دوبارہ بلانے کی ہر ممکن کوشش کر لی مگر وہ واپس نہیں لوٹے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ قول رسولؐ ہے کہ جو شخص کسی ایسے دسترخوان پر بیٹھ جائے جہاں شراب ہو تو اس پر پروردگار کی لعنت ہے۔ ؎

؎ بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۱۱۵

(۶۳)

سماعتِ قرآن کی خواہش

ابن مسعود عہد رسول میں وحی نویسی کا کام کیا کرتا تھا۔ یعنی وہ پروردگار کی طرف سے نازل ہونے والے قرآن مجید کی ہر آیت کو ایک جگہ پر پابندی کے ساتھ لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک روز رسول اکرم نے ابن مسعود سے کہا: "میری خواہش ہے کہ تم تلاوت قرآن کرو اور میں سنوں۔" ابن مسعود نے اپنا صحیفہ کھولا اور سورۂ نساء کی تلاوت شروع کر دی رسول مقبول پوری توجہ کے ساتھ تلاوت کلام پاک کی سماعت میں محو تھے۔ ابن مسعود سورۂ نساء کی ۴۱ ویں آیت کی تلاوت کی۔ فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علی ھؤلاء شھیدا۔ یعنی بھلا اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر گروہ کے گواہ طلب کریں گے اور (اے محمدؐ) تم کو ان سب پر گواہ کی حیثیت میں طلب کریں گے۔" جیسے ہی اس آیۂ کریمہ کی قرأت تمام ہوئی، رسول مقبولؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ارشاد فرمایا: "اے ابن مسعود! بس رک جاؤ۔ اتنا ہی کافی ہے۔"[1]

---

[1] کحل البصر، محدث قمی ص ۷۹

(۶۴)

شہرتِ عام

بہت دنوں سے عام لوگوں کے درمیان ایک شخص کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ ہر آدمی کی زبان پر اس کا نام ہوا کرتا تھا اور چاروں طرف اس شخص کے تقویٰ و تقدس اور دیانت داری و پرہیزگاری کے چرچے تھے۔ ہر جگہ لوگ اس کی بلند اخلاقی اور بزرگی کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اور اکثر امام جعفر صادقؑ کے سامنے بھی لوگوں نے اس شخص کے تقویٰ و پرہیزگاری اور حسن اخلاق کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ امام کو یہ فکر ہوئی کہ ایسے مردِ "بزرگوار" کو اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھنا چاہیے جس نے عوام کے درمیان اس قدر شہرت و مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ ہر آدمی اسے نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بہرحال ایک روز امام جعفر صادقؑ ایک انجان آدمی کی طرح اس کے پاس گئے تو کیا دیکھا کہ چاروں طرف اس کے ارادت مندوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے جن میں زیادہ تر افراد طبقۂ عوام سے تعلق رکھتے تھے۔

امام اپنا تعارف کرائے بغیر نہایت خاموشی کے ساتھ سارا ماجرا دیکھتے رہے پہلی ہی نظر میں انھیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوئی کہ وہ شخص عام لوگوں کی بھیڑ سے باہر نکلا اور سڑک کی طرف چل پڑا۔ امام بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے روانہ ہوگئے تاکہ یہ دیکھیں کہ وہ شخص کہاں جا رہا ہے اور کیا کرتا ہے اور وہ کونسا عمل ہے جس نے لوگوں کو اس شخص کا گرویدہ بنا رکھا ہے؟

تھوڑی دیر بعد وہ شخص ایک نانبائی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہوگیا اور امام کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دوکاندار کی نگاہ بچا کر اس شخص نے دو روٹیاں اپنے کپڑے کے نیچے چھپالیں۔ اور پھر آگے کی طرف روانہ ہوگیا۔ امام نے سوچا، ہوسکتا ہے اس کا مقصد ان روٹیوں کی خریداری ہو اور اس کی قیمت وہ پہلے ہی ادا کرچکا ہو یا بعد میں ادا کردے گا لیکن اگر ایسا کچھ تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے دوکاندار کی آنکھ بچا کر یہ روٹیاں اٹھالیں اور اس سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

غرضکہ امام اس شخص کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ ابھی وہ روٹی والی دوکان کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ وہ شخص ایک میوہ فروش کی دوکان کے سامنے کھڑا ہوا اور دوکاندار کی پلک جھپکتے ہی اس نے دو انار اٹھائے اور اپنے کپڑے کے نیچے چھپا کر آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھ کر امام کی حیرت میں اور اضافہ ہوگیا۔ لیکن اس وقت امام کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہ گیا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اس شخص نے وہ روٹیاں اور

وہ دونوں انار ایک مریض کو دیدیا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھنے کے بعد امام جعفرؑ صادق اس شخص کے قریب پہونچ گئے اور بولے "اے بھائی! آج میں نے تجھے عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" پھر امام نے شروع سے آخر تک کا ماجرا بیان کردیا اور اس سے اس ناجائز حرکت کی توضیح چاہی۔ اس شخص نے امام کو گھورتے ہوئے دیکھا اور بولا "میرا خیال ہے، تم جعفر بن محمد ہو۔"

" ہاں، تمہارا خیال درست ہے۔ میں جعفر بن محمد ہی ہوں۔"

"بے شک تم فرزند رسول خدا ہو اور شرافتِ نسب کے مالک بھی ہو لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم اتنے بڑے جاہل اور بیوقوف بھی ہو۔"

"آخر تو نے میری کونسی جہالت اور نادانی دیکھی ہے۔"؟

"تمہارا یہ سوال جہالت اور نادانی کی انتہا کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم دین کے سادہ اور آسان حساب کو سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے۔ "من جاء بالحسنة فله عشر امثالها۔" یعنی ہر نیک کام کی جزا دس گنی ہوتی ہے۔ اور ایک دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے۔"ومن جاء بالسیئة فلا یجزی الامثلها" یعنی ہر برے کام کی صرف ایک سزا ہوتی ہے۔ پس اس حساب کے اعتبار سے میں نے دو روٹیاں چرائیں تو دو خطا ہوئی۔ پھر میں نے دو انار چرائے لہذا یہ دو خطائیں بھی میرے حساب میں شامل ہو گئیں۔ دوسری طرف میں نے وہ دونوں

روٹیاں اور دونوں انار راہ خدا میں ایک بیمار آدمی کو دیدیے اور ہر ایک کے عوض دس نیکیاں میرے حساب میں درج ہو گئیں اور اس طرح نیک عمل کی دس گنی جزا کے طور پر مجھے چالیس نیکیاں حاصل ہو گئیں اور اب نہایت آسانی کے ساتھ یہ حساب لگایا جا سکتا ہے کہ میرے نامۂ اعمال میں ۴۰ اچھائیوں کے مقابلے میں برائی کی تعداد صرف چار ہے۔ پس ان چار برائیوں کو چالیس نیکیوں میں سے گھٹا دیا جائے تو بھی ۳۶ نیکیاں ہمارے حساب میں باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ سادہ اور آسان حساب جس کو تم نہیں سمجھ سکے اور مجھ سے ناداتی کا سوال کر بیٹھے۔

"خداوند عالم تجھے موت عطا کرے۔ دراصل جاہل تو ہے جو اپنے خیال میں اس قسم کے حساب لگا تا رہتا ہے۔ کیا تو نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں سنی:" انما یتقبل اللّٰہ من المتقین "۔ یعنی خداوند عالم صرف متقی و پرہیزگار لوگوں کے اعمال ہی قبول کرتا ہے "۔ "پس یہ سادہ اور آسان حساب تجھے تیری غلطیوں کی طرف متوجہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔ تو نے اپنے چار گناہ خود ہی تسلیم کئے ہیں اور لوگوں کا مال صدقہ اور خیرات کے نام پر دوسروں کو دیدیا ہے تو صرف اتنا ہی نہیں کہ اس میں کوئی ثواب نہیں ہے بلکہ اپنے اس فعل کے ذریعہ بھی تو نے ارتکاب گناہ ہی کیا ہے۔ اس طرح تیرے پہلے والے چار گناہوں میں چار دوسرے گناہوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس اعتبار سے آٹھ عدد گناہ تیرے نامۂ اعمال میں لکھ لیے گئے اور ثواب نام کی کوئی

چیز تجھے نہ حاصل ہوئی۔

امام کی یہ باتیں سن کر اس شخص کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے اور وہ ایک ٹک امام کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ یہ باتیں کہہ کر امام نے اس شخص کو وہیں چھوڑ دیا اور گھر واپس آ گئے۔

امام جعفر صادقؑ نے دوستوں سے یہ قصہ بیان کرتے وقت ارشاد فرمایا: "دینی امور میں اس قسم کی تغیر اور جاہلانہ توجیہ لوگوں کو گمراہ بنا دیا کرتی ہے اور پھر وہ دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔"[1]

---

[1] وسائل جلد ۲، ص ۷۵

maablib.org

(۶۵)

جس بات سے ابو طالبؑ کو تقویت حاصل ہوئی

رسولؐ متقبول گوناگون مصائب اور پریشانیوں کے باوجود قریش کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے ۔ بے شمار سخت اور دشوار گزار منزلوں سے گزرنے کے باوجود انھوں نے الٰہی مقاصد کی راہ میں پیش قدمی سے کام لیا ۔ وہ بتوں کو تحقیر و اہانت اور بت پرستوں کی نادانی اور گمراہی کو آشکار کرنے سے باز نہیں آتے تھے ۔ اکابر قریش ان کی باتوں سے تنگ آچکے تھے ۔ چنانچہ وہ لوگ ابو طالبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ یا تم اپنے بھتیجے کو خود سنبھال لو یا پھر قبیلہ قریش کے لوگوں کو یہ اجازت دیدو کہ وہ تمھارے بھتیجے کی تنبیہ کردیں ۔ حضرت ابو طالبؑ نے اپنی خوش اخلاقی اور شیریں بیانی کے ذریعہ قبیلہ قریش کے لوگوں کو خاموش کردیا ۔ یہاں تک کہ الٰہی مقاصد دھیرے دھیرے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے ۔ قبیلہ قریش کے لوگوں کو یہ ترقی

پسند نہ آئی ۔ گھر گھر میں محمدؐ کا چرچا تھا ۔ دو آدمی باہم ملاقات کے دوران یہ کہتے ہوئے نظر آتے کہ لوگ گروہ در گروہ اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں ۔ غرضکہ کوئی جگہ ایسی باقی نہ رہ گئی جہاں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا چرچا نہ ہو رہا ہو ۔ چنانچہ قبیلہ قریش کے بڑے لوگوں نے ابوطالبؑ سے دوبارہ ملاقات کا فیصلہ کیا تاکہ اس سلسلے میں مزید اور سخت و موثر انداز میں گفتگو کریں ۔

غرضکہ قبیلہ قریش کے بڑے لوگ ابوطالبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے : ہم لوگوں نے اس سے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ اپنے بھتیجے کو روک لو مگر تم نے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا اور ہم لوگوں نے بھی تمہاری بزرگی کا خیال کرتے ہوئے اب تک ان کی حرکتوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور یہ فیصلہ کیا تم سے بات کئے بغیر اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے ۔ لیکن آج ہم لوگ تم سے کہنے آئے ہیں کہ تمہارے بھتیجے کی حرکتیں اب آئندہ برداشت نہیں کی جائیں گی کیونکہ وہ ہمارے خداؤں کی عیب جوئی کے ساتھ ہی ہم لوگوں کو نادان اور کم عقل کہہ کر ہمارا مذاق اڑاتا ہے اور ہمارے آباء و اجداد کو بھی گمراہ ثابت کرتا ہے ۔ اس بار ہم لوگ صرف اتمام حجت کی خاطر تمہارے پاس آئے ہیں ۔ اگر آئندہ بھی تم نے اپنے بھتیجے کو نہ روکا تو ہم لوگ اب تمہاری بزرگی کا کوئی احترام نہ کریں گے اور تم دونوں کے خلاف جنگ کے ذریعہ اس بات کا آخری

فیصلہ کردیں گے۔

اس کھلی ہوئی دھمکی نے ابوطالب کو پریشان کردیا۔ اس سے قبل انھوں نے قبیلہ قریش کے بڑے سے بڑے آدمی کی زبان سے اس قسم کے جملے نہ سنے تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ ابوطالبؑ کے اندر اب اتنی طاقت نہیں رہ گئی کہ وہ قبیلہ قریش کا مقابلہ کرسکیں۔ چنانچہ اگر جنگ کی نوبت آہی گئی تو بھتیجے سمیت سارا خاندان تباہ و برباد ہوجائے گا۔

بہرحال ان تمام باتوں کا خیال کرتے ہوئے انھوں نے رسولؐ اکرم کے پاس ایک شخص کو بھیج کر انھیں ان تمام باتوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو اب یہ نوبت آگئی ہے۔ لہٰذا خاموشی اختیار کرلو کیونکہ ہماری اور تمھاری دونوں کی زندگی خطرے میں ہے۔"

رسول مقبولؐ نے فوراً سمجھ لیا کہ قریش کی دھمکی نے ابوطالبؑ کو متاثر کردیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے چچا کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے صرف ایک ہی بات کہی جس کو سن کر حضرت ابوطالبؑ کے دل و دماغ سے قریش کی دھمکی ہوا ہوگئی۔

"چچا جان! میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں پھر مجھ سے یہ مطالبہ کریں کہ میں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے سے باز آجاؤں تو بھی میں اپنے الٰہی مشن سے ہرگز کنارہ کشی نہ اختیار

کروں گا تاوقتیکہ خدا کا یہ دین آشکار نہ ہو جائے گا میں اپنی سرگرمیاں کو پوری طرح جاری رکھوں گا چاہے اس راہ میں میری جان بھی چلی جائے۔ یہ جملہ ادا کرنے کے بعد رسول کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے اور وہ اپنے چچا ابو طالبؑ کے پاس سے اٹھ کر چل دیئے۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ چچا ابو طالبؑ کے حکم سے دوبارہ واپس لوٹ آئے۔ ابو طالب نے کہا، اگر ایسی بات ہے تو تم جو کچھ مناسب سمجھتے ہو کرو۔ خدا کی قسم میں اپنی آخری سانس تک تمہاری حفاظت کرتا رہوں گا۔"[۱]

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ۲۶۵

maablib.org

(۶۶)

بوڑھا طالب علم

سکاکی ایک ماہر فنکار اور کاریگر آدمی تھا۔ اس نے نہایت مہارت اور دلچسپی کے ساتھ ایک ایسی عمدہ اور خوبصورت دوات بنائی جسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ اسے امید تھی کہ بادشاہ فنکارانہ مہارت کی تعریف کرتے ہوئے اس کی ہر ممکن حوصلہ افزائی بھی کرے گا۔ چنانچہ بے شمار امیدوں اور ہزاروں آرزوں کے ساتھ اس نے وہ دوات بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ شروع میں بادشاہ اس کی فنکاری سے بہت متاثر ہوا لیکن بعد میں ایک ایسا ناخوشگوار حادثہ پیش آیا جس نے سکاکی کی زندگی اور اس کی فکری صلاحیتوں میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کر دی۔

جس وقت بادشاہ اس خوبصورت دوات کی کاریگری کا معائنہ کر رہا تھا اور سکاکی خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ لوگوں نے اطلاع دی کہ ایک عالم، ادیب یا فقیہہ دربار میں تشریف لانے

والے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مرد عالم دربار میں داخل ہوئے بادشاہ ان کے استقبال اور ان سے گفتگو میں اتنا سرگرم ہو گیا کہ اسے سکاکی اور اس کی فنکارانہ مہارت کے سلسلے میں کچھ بھی یاد نہ رہ گیا یہ منظر سکاکی جیسے فنکار کے دل و دماغ کو متاثر کر دینے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ بادشاہ کی یہ بے توجہی اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کی وہ حوصلہ افزائی نہ ہو سکے گی اور اب کسی چیز کی آرزو یا امید کرنا بے کار ہے۔ لیکن سکاکی کی بلند پروازی اور فنکارانہ صلاحیت نے اسے سکون سے بیٹھنے نہ دیا اور وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟ اس نے فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے جو اب تک دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ ہمیں بھی وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا جو اب تک دوسرے لوگوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کھوئی ہوئی امیدوں کو علم و ادب اور کتابوں کی دنیا میں تلاش کرنے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ لیکن ایک ایسے عقلمند آدمی کے لئے جس نے اپنی جوانی کے دن دوسرے کاموں میں بسر کئے ہوں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہونا آسان نہ تھا پھر بھی وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ اور اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہ تھا۔ مچھلی کو جس وقت بھی پانی سے باہر نکالتے ہیں

وہ تازی ہوا کرتی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ دشوار بات یہ تھی کہ شروع میں اسے پڑھنے لکھنے میں کوئی دلچسپی نظر نہ آئی شاید ایک طویل عرصے تک فنکارانہ اور صنعتی کاموں میں مشغول رہنے کی وجہ سے اس کے علمی اور ادبی ذوق میں جمود پیدا ہو گیا تھا لیکن عمر کی زیادتی اور استعداد کی کمی اس کے فیصلے کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکی۔ اور وہ نہایت ذوق و شوق اور علمی لگن کے ساتھ درس حاصل کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اسی درمیان ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔

فقہ شافعی پڑھانے والے استاد نے اسے یہ مسئلہ سکھایا۔ "استاد کا عقیدہ ہے کہ کتے کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے۔" سکاکی نے اس جملے کو کم از کم دس بار دہرایا تاکہ امتحان کے موقع پر وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو سکے۔ لیکن جب اس سے اس درس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا "کتے کا عقیدہ ہے کہ استاد کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جایا کرتی ہے۔"

اس کا یہ جواب سن کر تمام حاضرین مجلس ہنسنے لگے۔ اور سب نے یہ خیال کیا کہ بوڑھے آدمی میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے، اس واقعے کے بعد سکاکی صرف وہ مدرسہ نہیں بلکہ شہر چھوڑ کر جنگل کی طرف چل پڑا۔ اتفاق سے وہ ایک ایسے پہاڑ کے دامن میں

پہونچ گیا جہاں اس نے دیکھا کہ ایک بلندی سے پتھر پر بوند بوند پانی ٹپک رہا ہے۔ اور بوند بوند پانی ٹپکنے کی وجہ سے اس سخت پتھر میں بھی سوراخ پیدا ہوگیا ہے۔ وہ کچھ دیر تک اسی موضوع پر سوچتا رہا۔ اس بات نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ اور کہنے لگا۔ "میرا دل پڑھنے لکھنے کی طرف چاہے بالکل ہی مائل نہ ہو لیکن اسمیں پتھر جیسی سختی تو نہیں ہے۔ لہذا یہ قطعی ناممکن سی بات ہے کہ میں لگاتار محنت کے ساتھ پڑھتا رہوں اور علم نہ حاصل کر سکوں" یہ سوچ کر وہ واپس لوٹ آیا اور حصول علم میں پوری طرح سرگرم ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد وہ اپنے عہد کے نامور دانشمندوں میں شمار کیا جانے لگا۔ ؎

؎ روضات الجنات ،مطبوعہ جدید صفحہ ۷۴

۶۷

ماہر علم نباتات

"شارل دولینہ" کے معلمین نے انتہائی یاس و نا امیدی کے ساتھ آپس میں یہ طے کیا کہ اس کے والد کے سامنے جو شہر کا پادری تھا یہ تجویز رکھیں کہ وہ اپنے لڑکے کو دستکاری وغیرہ کی ٹریننگ دلائے کیونکہ اس میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ حصول علم کی امید میں وقت ضائع کرنا قطعی بے سود ہے لہٰذا وقت بیکار کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ وہ اس درمیان کوئی اچھا سا ہنر سیکھ لے۔

معلمین کی بات سن کر لینہ کے والدین پر اداسی طاری ہو گئی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر اپنے دور کا بہت بڑا عالم بن جائے چنانچہ اس نا امیدی اور غیر معمولی اداسی کے باوجود انھوں نے اپنے لڑکے کو علم طب حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی بھیج دیا لیکن استعداد کی کمی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کے اخراجات کے لئے بہت تھوڑا سا روپیہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر اس کے ایک دوست نے

اس کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ یونیورسٹی کے احاطے میں بھوک کی شدت سے ہلاک ہوجاتا۔ لینہ کو والدین کی دلچسپی کے خلاف علم طب سے کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ وہ علم نباتات میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے گھاس وغیرہ کو بہت عزیز رکھتا تھا اور یہ خصلت اسے اپنے باپ سے میراث میں ملی تھی۔ اس کے باپ کا باغ خوبصورت قسم کے پیڑ پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس وقت لینہ بہت کم سن تھا اس کی ماں کی یہ عادت تھی کہ روتے ہوئے لینہ کو بہلانے کے لئے وہ اس کے ہاتھ میں خوبصورت پھول دے دیا کرتی تھی اور لینہ وہ خوبصورت پھول لیکر خوش ہوجایا کرتا تھا۔

جس زمانے میں وہ میڈیکل کالج میں علم طب حاصل کر رہا تھا اسے فرانس کے مشہور گیاہ شناس کی ایک کتاب مل گئی چنانچہ گھاس پھوس اور پھول پتیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی دلچسپی جاگ اٹھی۔ اس زمانے میں ماہرین گیاہ شناس کے سامنے گھاس اور دیگر نباتات کی صحیح طبقہ بندی کا مسئلہ بڑے زوروں پر چل رہا تھا اس علم میں اپنی مخصوص دلچسپی کی وجہ سے لینہ تذکیر و تانیث کی بنیاد پر گھاس اور دیگر نباتات کی ایک مخصوص اور صحیح طبقہ بندی کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس نے ایک زبردست کتاب تحریر فرمائی جو اس عہد کے مشہور و معروف ماہرین علم نباتات کے درمیان بہت مقبول ہوئی۔ کتاب کی اشاعت کے بعد میڈیکل کالج

انتظامیہ کی طرف سے یہ سوچا جانے لگا کہ لینہ کو اس میدان کی جملہ سہولتیں اسی کالج میں فراہم کرادی جائیں تاکہ وہ مزید تحقیقی کام انجام دے سکے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے حسد کی وجہ سے یہ اسکیم جامۂ عمل نہ پہن سکی۔

لینہ اپنی شاندار کامیابی پر جھوم اٹھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کامیابی کا مزہ چکھا تھا۔ لیکن اسے اس عظیم کامیابی کی خصوصیت کا اندازہ نہ تھا۔ وہ اس میدان میں نئی نئی معلومات کی تلاش میں ہمہ تن سرگرم ہوگیا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ علوم طبیعی میں اور زیادہ مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک طویل سفر کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اسباب سفر کے طور پر ایک صندوق، کچھ کپڑے، ایک دوربین اور کچھ کاغذات اپنے ساتھ لے کر لینہ پاپیادہ طویل سفر پر نکل پڑا۔ اس نے سات ہزار کلومیٹر کا سفر بے شمار مصائب اور پریشانیوں میں طے کیا اور مختلف قیمتی معلومات اور بیش قیمت علمی ذخائر کے ساتھ ایک طویل مدت کے بعد وطن واپس آگیا۔ تقریباً تین برس بعد ۱۷۳۵ء میں وطن کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے لینہ سویڈن سے ہامبرگ چلا گیا۔ لینہ نے اس سفر کے دوران بہت سی نادر روزگار اشیاء جمع کی تھیں چنانچہ ہامبرگ کے میوزیم میں اس نے میوزیم کے چیئرمین کو وہ تمام چیزیں دکھائیں جو اس نے سفر کے دوران جمع کی تھیں۔ ان چیزوں میں ایک نیلے رنگ کا سانپ بھی تھا جس کے سات سر تھے۔ سانپ کے ساتوں سر بالکل ایک جیسے تھے۔ میوزیم کے افسران نے اس بات کی

اطلاع قاضی تک پہونچادی۔ قاضی نے لینہ کی آمد کو بدشگونی پر محمول کرتے ہوئے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور حکم دیا کہ اسے فوراً ہی شہر سے باہر نکال دیا جائے۔ لینہ نے اس کے بعد بھی اپنے سفر کا سلسلہ جاری رکھا۔ دوران سفر ہی میں اس نے علم طب میں ڈاکٹریٹ کی سند کے حاصل کرنے کے لئے اپنا تحقیقی مقالہ تیار کر ڈالا۔ اس نے اپنی عظیم الشان کتاب "فطرت کی توانائی" سفر کے دوران شہر لیدن میں شائع کردی۔ اس کتاب کی وجہ سے اسے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی اور AMSTERDAM کے ایک دولتمند تاجر نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں آپ کے لئے ایک نہایت عمدہ اور عالیشان باغ کا انتظام کئے دیتا ہوں جہاں بیٹھ کر آپ مزید تحقیقی خدمات انجام دے سکیں۔ اس نے یہ بات مان لی اور اپنے ایک معاون کے ساتھ اسی باغ میں علمی تحقیق کا کام کافی بڑے پیمانے پر شروع کردیا۔ اس کے بعد اس نے فرانس کا سفر بھی کیا اور وہاں کے "مودون" نامی جنگلوں سے مختلف انواع و اقسام کی گھاس اور نباتاتی نمونے جمع کئے۔ آخر کار لینہ مسافرت اور پردیس کے غم اور وطن کی محبت میں مبتلا ہو کر سویڈن واپس آگیا۔ اس بار وطن والوں نے اس کی عالمی شہرت و مقبولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا زبردست استقبال کیا اور اس کی سہولت کے تمام سامان فراہم کردیئے۔ یہی وہ وطن تھا جہاں لینہ کے مدرسین نے کچھ دنوں قبل اسے درس دینے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا تھا۔[1]

---

[1] تاریخ علوم پی. بروسو۔ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۴

(۶۸)

سخنور

دموستھنس یونان قدیم کا مشہور و معروف خطیب اور سیاستمدار تھا۔ یہ مشہور یونانی فلسفی ارسطو کا ہم عصر تھا۔ سن بلوغ کو پہونچنے سے کچھ قبل وہ ایک تقریر کی تیاری کر رہا تھا۔ تقریر کے ذریعہ اس کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ لوگوں پر اپنے علم کا رعب جمائے اور اپنی تقریر کے ذریعہ وہ یہ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ دربار عدالت میں وکالت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت کا مالک ہے، بلکہ وہ اپنی تقریر کے ذریعہ ان لوگوں کے خلاف کچھ اظہار خیال کرنا چاہتا تھا جنھوں نے اس کی کم سنی کے عالم میں اس کے باپ کی بہت بڑی دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ لوگ اس کے باپ کے دوست اور باپ کی وفات کے بعد اس کی سرپرستی کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

شروع میں اس نے ہر ممکن کوشش کی مگر میراث میں کوئی چیز بھی اسے حاصل نہ ہو سکی۔ اور وہ اس خیانت کا مجمع عام میں تذکرہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شروع میں لوگوں نے اس کی تقریر میں کوئی دلچسپی نہ لی اور کسی قسم کی معمولی سی حوصلہ افزائی کے بجائے لوگوں نے اس کی تقریر

میں طرح طرح کی خامیاں نکالنی شروع کردیں۔ کوئی انشاء کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا کرتا تھا تو کوئی اس کی آواز میں عیب نکال رہا تھا۔ لیکن ان تمام ناسازگار حالات کے باوجود اپنی غیر معمولی صلاحیت انتھک محنت اور دوستوں کی تشویق کی بدولت اس نے اس طرح کی ساری خرابیوں کو پوری طرح دور کرلیا۔ اس نے اپنے لئے ایک خفیہ جگہ منتخب کرلی اور پوشیدہ طریقے سے تقریر کی مشق کرنے لگا وہ اپنی آواز اور لہجہ درست کرنے کے لئے منہ میں بالو رکھ کر نہایت بلند آواز میں شعر پڑھا کرتا تھا تاکہ اس کی آواز اچھی ہوجائے وہ اپنی سانس کو طاقتور بنانے کے لئے طویل نظموں کو زوردار آواز سے پڑھا کرتا تھا۔ اکثر وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر تقریر کی مشق بھی کرتا تھا تاکہ خود اپنے ہی چہرے پر رونما ہونے والے تاثرات کا اندازہ لگا سکے اور اس کی جھجک بھی دور ہوجائے۔ بہرحال محنت اور لگن کی وجہ سے اس نے اس میدان میں بڑی ترقی کی اور تھوڑے دنوں بعد ہی وہ دنیا کے مشہور سخنوروں میں شمار کیا جانے لگا۔[1]

---

[1] آئین سخنوری از مرحوم محمد علی فروغی جلد ۲، ص ۵ و ۶

(۶۹)

طائف کے سفر کا پھل

رسول مقبولؐ کے چچا حضرت ابو طالبؑ اور انکی زوجۂ مہربان خدیجہ کچھ دنوں کے وقفے سے دونوں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس طرح رسول اکرمؐ اس چچا کی شفقتوں سے محروم ہو گئے جو گھر کے باہر ان کا دفاع کیا کرتا تھا اور کچھ دنوں کے اندر خدیجہ جیسی شریک حیات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے جو اندرون خانہ ان کی دلجوئی کا سامان فراہم کیا کرتی تھیں۔

ابوطالبؑ کی وفات سے رسول مقبول کو بڑا صدمہ پہونچا۔ ان کی وفات کی وجہ سے قریش کو موقع مل گیا کہ وہ رسول مقبولؐ کو طرح طرح سے پریشان کریں چنانچہ ان لوگوں نے تبلیغ اسلام کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ابھی ابو طالبؑ کی وفات کو چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ لوگوں نے گلی سے گزرتے ہوئے رسولؐ کے سر پر کوڑے کرکٹ کی ٹوکری پھینک دی چنانچہ ان کا تمام جسم خاک آلود

ہوگیا اور وہ اسی حالت میں گھر واپس آئے۔ ان کی بیٹی (فاطمہ سلام اللہ علیہا) دوڑتی ہوئی آئیں اور باپ کے خاک آلودہ سر اور بال صاف کرنے لگیں۔ رسول اکرمؐ نے دیکھا کہ دختر عزیز کی آنکھوں سے اشک جاری ہیں۔ انھوں نے ارشاد فرمایا: میری بیٹی گریہ مت کرو اور زیادہ صدمہ مت اٹھاؤ۔ تمہارا باپ تنہا نہیں ہے بلکہ پروردگار اس کا نگہبان ہے:

اس واقعے کے بعد تبلیغ اسلام کی غرض سے رسولؐ مقبول شہر مکہ سے تنہا نکل پڑے اور قبیلہ ثقیف کے درمیان دین خدا کی تبلیغ کے لیے شہر طائف کی طرف چل پڑے۔ طائف اچھی آب و ہوا اور پرکشش ماحول کے لئے مشہور تھا اور مکہ کے دولتمند لوگ یہاں سیر و تفریح کے لئے برابر آیا کرتے تھے۔

طائف کے لوگوں سے بہت زیادہ امید نہ تھی۔ ان لوگوں کے جذبات و خیالات بھی بالکل ویسے ہی تھے جیسے خانۂ کعبہ کی مجاورت میں زندگی بسر کرنے والے دوسرے اہل مکہ کے تھے یہ لوگ بھی بت پرستی کے سایہ میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔

لیکن رسول اکرمؐ مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہونے والے نہ تھے۔ وہ ان مشکلات کے بارے میں برابر غور و فکر کیا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ لوگوں کا دل جیتنے کے لئے بڑی سے بڑی دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ تن آمادہ رہا کرتے تھے۔

وہ شہر طائف میں داخل ہوئے اور اہل طائف کی زبان سے بھی

وہی باتیں سنیں جو اکثر مکہ والوں کی زبان سے سنا کرتے تھے۔ ایک شخص نے کہا: "کیا دنیا میں کوئی اور نہ تھا کہ خداوند عالم نے تمھیں رسول بنا کر بھیجا؟" دوسرے نے کہا: "غلاف خانہ کعبہ کی قسم تو پیغمبر خدا نہیں ہے۔" اور تیسرے شخص نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میں تم سے بات کرنے کے لئے قطعی آمادہ نہیں ہوں۔" غرضکہ لوگوں نے رسول مقبولؐ کو اس قسم کے حوصلہ شکن جواب دینے شروع کر دیئے۔

مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ طائف کے لوگوں نے رسول مقبولؐ کی تبلیغ پر قطعی توجہ نہ دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے شہر کے اوباش لوگوں اور غنڈوں سے کہا کہ رسول اکرمؐ کو شہر سے باہر نکال دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ سادہ دل لوگ ان کی تبلیغ کا شکار ہو جائیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے رسولؐ کے اوپر پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور انھیں گالیاں بھی دیں۔ اس طرح رسول اکرمؐ کو زخمی حالت میں شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ زخموں سے چور شہر کے باہر واقع ایک باغ میں داخل ہوئے۔ یہ باغ قبیلۂ قریش کے عتبہ و شیبہ نامی دولت مند تاجروں کا تھا۔ اتفاق سے اس وقت باغ کے دونوں مالک وہاں موجود تھے اور دور کھڑے ہوئے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور رسول کی یہ حالت دیکھ کر انھیں بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد طائف کے غنڈے واپس چلے گئے اور رسول مقبولؐ عتبہ و شیبہ سے دور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہ بالکل تنہا تھے

صرف ان کا پروردگار ہی ان کے ساتھ تھا۔ چنانچہ انھوں نے رب بے نیاز سے راز و نیاز کی باتیں کرنی شروع کردی کہنے لگے۔

"اے میرے مالک! میں تیری بارگاہ میں اپنی کمزوری و ناتوانی اور ان لوگوں کی بدسلوکی و ایذا رسانی کی شکایت کرتا ہوں۔ انھوں نے ہماری راہ میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کردی ہیں۔ اے سب سے زیادہ مہربانی کرنے والے پروردگار! تو پسماندہ اور کچلے ہوئے طبقے کے لوگوں کا خدا ہے۔ تو میرا خدا ہے اور مجھے کن لوگوں کے درمیان چھوڑ رکھا ہے یہ لوگ مجھے زخمی کر رہے ہیں اور تو بالکل بیگانوں کی طرح سلوک کر رہا ہے۔ کیا تو نے دشمن کو میرے اوپر تفوق و برتری عطا کردی ہے؟ اے مالک کائنات! مجھے بخوبی علم ہے کہ مجھ پر جو مصائب ڈھائے گئے ہیں میں اس کا مستحق نہیں ہوں پھر بھی ہر حال میں مجھے تو بس تیری رضا و خوشنودی درکار ہے۔ اگر تو راضی ہے تو پھر مجھے کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ میں تیری اس نورانی ذات کے سایہ میں پناہ لیتا ہوں جس نے کائنات سے تاریکی کا بالکل خاتمہ کردیا اور ظلمت کدہ کائنات روشن و تابناک ہوگیا۔ تیری ذات کی بدولت دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہوگئے ہیں۔ چاہے تو مجھ پر اپنا عذاب نازل کردے پھر بھی میں تیری طرف سے ملنے والی ہر چیز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ میری تو ہر وقت یہی کوشش ہے کہ تو مجھ سے راضی ہوجا۔ کائنات میں تجھ سے بڑا

طاقتور کوئی اور نہیں ہے اور تو کائنات کی ہر شے پر قادر ہے۔"

باغ کے مالک عتبہ و شیبہ کو رسول اکرمؐ کی شکست سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ پھر بھی انھوں نے اپنے غلام "عداس" کو حکم دیا کہ ایک پلیٹ انگور لیجا کر اس آدمی کے سامنے رکھ دو جو دور اس درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اس مسیحی غلام کو یہ بھی ہدایت دی کہ انگور دے کر فوراً ہی واپس لوٹ آنا۔

"عداس" انگور لئے ہوئے آیا اور رسول مقبول کے سامنے رکھتے ہوئے بولا: "اسے کھالے۔" رسول مقبولؐ نے انگور ہاتھ میں لیا اور کھانے سے پہلے کلمۂ بسم اللہ ادا کیا۔

اس سے قبل "عداس" نے یہ کلمہ کبھی نہ سنا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ یہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ اس نے رسول مقبول کے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا: "یہ جملہ تو اس علاقے کے لوگوں کا معمول نہیں ہے میں نے یہاں کے لوگوں کی زبان سے یہ جملہ کبھی نہیں سنا۔ آخر یہ کون سا جملہ تھا؟"

رسول اکرم: اے عداس! تو کہاں کا رہنے والا ہے اور تیرا مذہب کیا ہے؟

"میں بنیادی طور پر نینوا کا رہنے والا ہوں اور مذہبی اعتبار سے عیسائی ہوں۔"

"تو نینوا کا رہنے والا ہے یعنی یونس بن متی جیسے صالح بندۂ خدا کا ہموطن ہے۔"

"تعجب ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں یونس بن متی کا نام کیسے معلوم ہوا؟ جس زمانے میں میں نینوا میں رہا کرتا تھا وہاں ایسے دس آدمی بھی نہ تھے جو یونس کے باپ "متی" کا نام جانتے ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ تمھیں یہ نام کیسے معلوم ہوگیا۔"

"یونس میرے بھائی ہیں۔ وہ خدا کے پیغمبر تھے اور میں بھی خدا کا پیغمبر ہوں۔"

عتبہ و شیبہ دور کھڑے دیکھتے رہے کہ "عداس" گفتگو میں محو ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ ان لوگوں کی ہر ممکن کوشش یہ ہوا کرتی تھی کہ رسول اکرم سے لوگ ملاقات و گفتگو نہ کرنے پائیں۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد لوگ اسلام قبول کر لیا کرتے ہیں۔ بہرحال ان لوگوں نے جو سوچا تھا وہ صحیح نکلا اچانک ان لوگوں نے دیکھا کہ عداس خاک پر گر پڑا اور رسول کے ہاتھوں اور قدموں کو بوسہ دینے لگا۔ ایک نے دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "دیکھا، بیچارے غلام کو اس نے خراب کر ڈالا۔"[1]

---

[1] سیرہ ابن ہشام جلد ا ص ۴۱۹ - ۴۲۱

maablib.org

(۷۰)

ابواسحاق صابی

ابواسحاق صابی چوتھی صدی ہجری کے مشہور اور نامور عالموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ کچھ دنوں تک عباسی خلیفہ کے دربار میں اور ایک مدت تک عزالدولہ بختیار آل بویہ کے دربار میں ملازم تھا۔ ابواسحاق صابی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان کے لوگ توحید پر ایمان رکھتے ہیں مگر نبوت پر ان کا کوئی عقیدہ وایمان نہیں ہوا کرتا۔ عزالدولہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ ابواسحاق اسلام قبول کرلے مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ابواسحاق رمضان المبارک کے مہینے میں مسلمانوں کا احترام کرتے ہوئے روزہ بھی رکھتا تھا۔ اور اسے قرآن مجید بھی حفظ تھا۔ وہ اپنے خطوط اور دیگر تحریروں میں قرآن مجید کی آیتوں کا حوالہ بھی دیا کرتا تھا۔

ابواسحاق ایک عقلمند ادیب اور نامور شاعر تھا اور اس دور کے جلیل القدر عالم اور عظیم المرتبت شاعر سید شریف رضی سے اس کی

گہری دوستی تھی۔ ۳۸۴ھ میں ابو اسحاق اس دنیا سے اٹھ گیا۔ سید رضی نے اپنے جگری دوست کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ نظم کیا جس کا مضمون اس طرح ہے:

"کیا تم لوگوں نے دیکھا کہ کیسی بلند شخصیت کا جنازہ اٹھ گیا۔ کیا تم لوگوں نے دیکھا کہ شمع محفل کس طرح خاموش ہو گئی۔"

"ایسا پہاڑ زمین پر گر پڑا کہ اگر یہ بھاری بھرکم پہاڑ دریا میں گر جاتا تو دریا میں ہیجان پیدا ہو جاتا اور اس کی سطح کف آلود ہو جاتی۔"

"تیری وفات سے قبل مجھے یقین نہ آتا تھا کہ مٹی تجھ جیسے کوہِ عظیم کو اپنے دامن میں چھپا سکتی ہے۔"[1]

اس کے بعد کچھ کوتاہ نظر لوگوں نے سید رضی کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور کہنے لگے۔ تجھ جیسے ذریت رسول کے لئے یہ بات قطعی زیبا نہیں دیتی کہ ایک صابی مذہب شخص کی وفات پر مرثیہ لکھ کر اظہار افسوس کرے جبکہ صابی شریعت اسلام کا منکر تھا۔

سید رضی نے اعتراض کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے کہا: "میں نے ابو اسحاق صابی کا مرثیہ اس کے علم و فضل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ہے بلکہ درحقیقت میں نے اس کے علم و فضل کا مرثیہ کہا ہے۔"[2]

---

[1]

ارأيت من حملوا على الاعواد — ارأيت كيف خبا ضياء النادي
جبل هوى لو خر في البحر غدا — من ثقله متتابع الازباد
ما كنت اعلم قبل حطك في الثرى — ان الثرى تعلو على الاطواد

[2] وفیات الاعیان ابن خلکان جلد ۱، ص ۳۶ والکنی والالقاب محدث قمی جلد ۲، ص ۳۶۵ ذیل عنوان "الصابی"

(۷۱)

حقیقت کی تلاش میں

عنوان بصری حقیقت کی تلاش میں سرگردان رہا کرتا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ سرچشمۂ یقین تک پہونچ جائے۔ مصائب سفر برداشت کرنے کے بعد وہ مدینہ پہونچ گیا۔ ان دنوں مدینہ اسلامی تبلیغ کا مرکز تھا۔ ہمہ وقت فقہا اور محدثین کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مدینہ پہونچکر وہ اس عہد کے مشہور و معروف فقیہہ و محدث مالک ابن انس کے شاگردوں میں شامل ہوگیا۔

حسب معمول مالک کے یہاں رسول مقبولؐ کی احادیث کی جمع آوری کا سلسلہ چل رہا تھا۔ دیگر شاگردوں کی طرح عنوان بصری نے بھی حدیث رسولؐ کے لکھنے پڑھنے کا کام شروع کردیا۔ یہاں تمام شاگردوں کو علم حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی اور انھیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ سند حدیث کی پہچان کیونکر کی جاتی ہے۔ عنوان بصری کے دل میں حقیقت آگاہی کی تڑپ پہلے ہی موجود تھی چنانچہ اس کام میں اسے بڑا سکون ملا وہ

نہایت اطمینان کے ساتھ اس تحقیقی کام کے ذریعہ اپنے جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرتا رہا۔

ان دنوں امام جعفر صادق علیہ السلام مدینے میں موجود نہ تھے۔ کچھ دنوں بعد وہ مدینہ واپس آگئے۔ عنوان بصری کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کچھ دنوں تک امام صادقؑ کی شاگردی بھی کی جائے چنانچہ وہ مالک ابن انس کے یہاں سے بارگاہِ صادقِ آلِ محمدؐ کی طرف چل پڑا۔

لیکن امام صادقؑ نے شوق کی آگ کو اور زیادہ بھڑکانے کی غرض سے کچھ دنوں تک عنوان بصری سے پرہیز کیا۔ ایک دن انھوں نے عنوان بصری کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ میں انتہائی مصروف اور قطعی عدیم الفرصت آدمی ہوں۔ صبح سے رات تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا کرتا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہاری خواہش پوری کر سکوں۔ لہٰذا تم پہلے کی طرح مالک ابن انس کے درس میں شامل رہا کرو۔ میں تمھیں درس دینے سے معذور ہوں۔ اگر وقت ہوتا تو میں تمھاری خواہش ضرور قبول کر لیتا۔

امام جعفر صادق کا جواب سنکر عنوان بصری بہت رنجیدہ ہوا۔ اور اس نے اپنے آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اگر مجھ میں استعداد و قابلیت نظر آتی تو امام میری خواہش کو ضرور قبول کر لیتے۔ چنانچہ وہ نہایت رنجیدہ حالت میں مسجد نبوی میں داخل ہوا

اور سلام عرض کرنے کے بعد سر جھکائے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے چہرے سے رنج و غم اور صدمۂ جانکاہ کے آثار نمایاں تھے۔

دوسرے دن وہ گھر سے باہر نکلا اور روضہ کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہونچ کر اس نے دو رکعت نماز ادا کی اور قادر متعال کی بارگاہ میں دعا کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور رنج و غم میں ڈوبے ہوئے دل سے یہ آواز نکلنے لگی۔

"اے پروردگار عالم! تو سب دلوں کا مالک ہے۔ تیری بارگاہ میں بس میری اتنی ہی التجا ہے کہ جعفر بن محمدؑ کے دل کو میرے لئے مہربان بنا دے تاکہ میرے اوپر بھی ان کی نگاہ کرم ہو جائے اور میں ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرسکوں۔ اور حصول علم کے ذریعہ تیرا سچا راستہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہو۔"

نماز و دعا سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ سیدھے گھر واپس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کے دل میں امام صادقؑ کی محبت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ محبت میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ اس کے رنج و غم میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا کہ افسوس مجھے امام صادقؑ کی شاگردی کا شرف نہ مل سکا۔ اور یہ صدمہ عنوان بصری پر پوری طرح غالب آگیا چنانچہ وہ اپنے گھر کے ایک گوشے میں مقید ہوگیا۔ فریضۂ نماز کی ادائیگی کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات ابھر رہے تھے۔

ایک طرف امام کی معذرت خواہی تھی اور دوسری طرف اس کا جذبۂ شاگردی
اس کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اے کاش کوئی
صورت ایسی نکل آئے کہ امام صادقؑ مجھے اپنا شاگرد تسلیم کریں۔ غرضکہ
اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس کا صدمہ بڑھتا چلا گیا۔ اور بے پناہ
صدمہ کی وجہ سے وہ دن بہ دن کمزور ہوتا چلا گیا۔ مختصر یہ کہ ایک دن اس کے
صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا اور وہ دوبارہ امام کے دروازے پر پہونچ گیا۔

خادم نے سوال کیا "کیا کام ہے؟"

"کوئی خاص کام نہیں ہے۔ میں تو صرف امام کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا ہوں۔"

"امام نماز میں مشغول ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد خادم آیا اور بولا "بسم اللہ، تشریف لایئے۔"

عنوان بصری گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ امام کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اس نے سلام عرض کیا۔ امام نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے لئے دعا بھی کی۔ اس کے بعد امام نے پوچھا "تمہاری کنیت کیا ہے؟"

"ابو عبداللہ"

"خداوند عالم تمہاری اس کنیت کی حفاظت کرے اور توفیقات میں اضافہ فرمائے۔"

امام کے منہ سے دعا کے چند جملے سننے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ اگر اور کچھ نہ حاصل ہو سکا تو میرے لئے یہ دعا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد

امام نے اس سے دریافت کیا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا کام کیا ہے اور کس مقصد کے لئے یہاں تشریف لائے ہو"؟

"میں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی ہے کہ پروردگار آپ کے دل میں میرے لئے کچھ جگہ دیدے تاکہ میں آپ کے علم سے کچھ استفادہ کرسکوں مجھے امید ہے کہ پروردگار نے میری یہ دعا قبول کرلی ہوگی۔"

"اے اباعبداللہ! خدا کی معرفت اور نور یقین ادھر اور ادھر بھٹکتے اور در در کی خاک چھاننے سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ کوئی دوسرا تجھے نور یقین نہیں عطا کرسکتا۔ یہ درسی علم نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ نور ہے جو پروردگار کی طرف سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ جب پروردگار اپنے کسی بندے کی ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں نور یقین خود بخود پیدا کردیتا ہے۔ اگر تم معرفت خدا اور نور یقین کی تلاش میں ہو تو عبودیت اور بندگی کی حقیقت کو اپنی روح کے اندر تلاش کرو۔ علم کو عمل کے راستے سے حاصل کرو اور پروردگار عالم سے دعا کرو وہ تمہارے دل کو نور یقین سے بھر دے گا۔"[1]

---

[1] الکنی والالقاب جلد ۲ ذیل کلمۂ البصری نیز بحار الانوار جلد ۱ ص ۲۲۴ حدیث ۱۷

(۷۲)

طالبِ یقین

نظامیۂ بغداد اور نظامیۂ نیشاپور سلجوقی دورِ حکومت کے دو درخشاں ستارے تھے۔ ان دونوں عظیم یونیورسٹیوں میں بے شمار طالب علموں کی بھیڑ لگی رہتی تھی سنہ ۴۵۰ تا ۴۷۸ھ کے دوران ابوالمعالی امام الحرمین جوینی نظامیہ نیشاپور کے وائس چانسلر تھے۔ دور دراز سے آئے ہوئے سینکڑوں طالب علم ان کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اپنے تمام شاگردوں میں امام الحرمین تین ہونہار اور ذہین طالب علموں کی استعداد اور غیر معمولی ذہانت سے بہت متاثر تھے۔ محمد غزالی طوسی، کیا ھراسی اور احمد بن محمد خوافی۔

ان تینوں طالب علموں کے بارے میں امام الحرمین کے یہ جملے زبان زدِ خاص و عام تھے: "غزالی ایک امڈتا ہوا دریا ہے، کیا ھراسی ایک درندہ شیر ہے اور خوافی ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔" ان تینوں میں غزالی کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح محمد غزالی نیشاپور

یونیورسٹی کے چشم و چراغ تھے۔

۴۷۸ھ میں امام الحرمین کی وفات ہوگئی۔ ان دنوں غزالی اپنے آپ کو عدیم المثال شخصیت سمجھتے تھے۔ ان کے دل میں سلجوقی حکومت کے دانشمند وزیر خواجہ نظام الملک طوسی کی خدمت کا خیال پیدا ہوا۔ ان دنوں اس علم دوست وزیر کے دربار میں نامور علماء و فضلا کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ سبھی لوگوں نے غزالی کا پرجوش استقبال کیا۔ اور انھیں مختلف مناظروں اور مباحثوں میں عظیم کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اسی دوران نظامیہ بغداد کے وائس چانسلر کی جگہ خالی ہوئی تھی اور انتظامیہ کو ایک ایسے باصلاحیت استاد کی تلاش تھی جو درس و تدریس کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ اور اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے غزالی سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ ۴۸۴ھ میں غزالی بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد تشریف لائے اور نظامیہ بغداد کی کرسئ صدارت پر جلوہ افروز ہوگئے۔

اس طرح غزالی کو اس دور کا سب سے بڑا علمی اور روحانی منصب حاصل ہوگیا چنانچہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے مذہبی عالم اور مرجع دین سمجھے جانے لگے۔ وہ اہم سیاسی مسائل میں بھی باقاعدہ مداخلت کیا کرتے تھے خلیفہ وقت المقتدر باللہ اور اس کے بعد المستظہر باللہ اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور غزالی ترقی کی آخری منزلوں تک پہونچ چکے تھے۔ اور اس عہد کا سب سے اہم عہدہ انھیں کے پاس تھا۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزالی

روحانی اور علمی سیادت کی آخری منزلوں پر پہنچ چکے تھے اور لوگوں کے دل پر ان کی غیر معمولی ترقی کا رعب طاری تھا لیکن اسی زمانے میں ان کے روح کی گہرائیوں سے ایک ایسا شعلہ رونما ہوا جس نے ان کے خرمن حیات اور تمام جاہ وجلال کو بالکل تباہ کر ڈالا۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے غزالی کے دل میں ایک ایسا خفیہ احساس پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے انھیں ہر وقت سکون واطمینان اور یقین کی تلاش تھی۔ لیکن دنیاوی شہرت ومقبولیت اور جملہ ہمعصر علماء وفضلا پر سبقت لے جانے کی خواہش نے اس خفیہ احساس کو کسی حد تک دبا رکھا تھا اور وہ اس موضوع پر زیادہ غور وفکر کا موقع نہیں پاتے تھے۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے دنیاوی ترقی کی آخری منزلیں طے کرلیں، ان کا وہ خفیہ احساس دوبارہ بھڑک اٹھا اور انھوں نے حقیقت جوئی اور یقین طلبی کا سلسلہ شروع کردیا۔ اور یہ حقیقت ان پر پوری طرح واضح ہوگئی کہ ان کے استدلالات اور بحث ومباحثے کے دوران پیش کئے جانے والے ٹھوس اور بامعنی دلائل دوسروں کو تو قانع کردیا کرتے ہیں۔ لیکن ان دلائل واستدلال سے خود ان کا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ انھوں نے بخوبی سمجھ لیا کہ تعلیم وتعلم اور بحث ومباحثہ کافی نہیں ہے بلکہ سیر وسلوک اور مجاہدت وتقویٰ لازمی ہے۔ چنانچہ اپنی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا: شراب کے نام سے مستی، روٹی کے نام سے شکم سیری اور دوا کے نام سے شفا وصحت اور بہبودی

نہیں حاصل ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح حقیقت کے بارے میں بحث وگفتگو کے ذریعہ سکون واطمینان اور یقین نہیں حاصل ہوتا بلکہ حقیقت ویقین کے حصول کے لئے ایک خالص طلب کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور دنیاوی شان وشوکت جاہ وحشم اور شہرت ومقبولیت سے محبت اس کے لئے قطعی مناسب اور موزون نہیں ہے۔

غرضکہ ان کے دل میں ایک عجیب وغریب کشمکش پیدا ہوگئی۔ یہ ایسا درد تھا جس سے صرف وہ اور ان کا پروردگار ہی واقف تھا اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو اس کی اطلاع تک نہ تھی۔ تقریباً چھ ماہ تک اس کشمکش کا سلسلہ چلتا رہا۔ اور اس کشمکش کی شدت کا عالم یہ تھا کہ ان کا کھانا، پینا اور سونا دشوار ہوگیا۔ اور ان پر سکوت چھا گیا۔ وہ اکثر اوقات خاموش اور خیالوں کی دنیا میں گم رہنے لگے۔ درس وتدریس کی طاقت باقی نہ رہ گئی۔ ہاضمہ خراب ہوا اور وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ اطباء نے معائنہ کیا اور روحانی بیماری تشخیص کی۔ علاج کی کوئی صورت باقی نہ رہ گئی۔ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا ان کی فریاد رسی کرنے والا نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے پروردگار سے دعا کی کہ اس کشمکش سے نجات دلادے کوئی آسان بات نہ تھی۔ ایک طرف ان کا خفیہ روحانی احساس تیزی سے کام کر رہا تھا اور دوسری طرف دنیاوی ترقی اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت سے کنارہ کشی اختیار کرلینا آسان کام نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ منزل آگئی کہ ان کی نگاہوں میں دنیاوی جاہ وحشم اور اعلی منصب کی کوئی قدر وقیمت باقی نہ رہی اور انہوں نے تمام دنیاوی مصروفیات سے کنارہ کشی کا

فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس بات کا قطعی اظہار نہ کیا انھیں معلوم تھا کہ فیصلے کی خبر ملتے ہی لوگ ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں گے چنانچہ سفرِ مکہ کے بہانہ وہ بغداد سے باہر نکلے۔ کچھ دور چلنے کے بعد لوگ انھیں خدا حافظ کہنے کے بعد بغداد واپس لوٹ آئے۔ لوگوں سے چھٹکارا پاتے ہی مکہ کے بجائے وہ شام اور بیت المقدس کی جانب روانہ ہو گئے۔ انھوں نے اس سفر کے دوران درویشانہ لباس پہن لیا تھا تاکہ لوگ کسی قسم کی مزاحمت نہ کر سکیں اور کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون ہیں۔ ان کے طویل سفر کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ دس برس کی ریاضت کے بعد انھیں جس چیز کی تلاش تھی یعنی یقین اور روحانی سکون وہ حاصل ہو گیا۔[1]

---

[1] ترجمہ المنقذ من الضلال (اعترافات غزالی) و تاریخ ابن خلکان جلد ۵ ص ۳۵۱-۵۲ اور غزالی نامہ۔

۷۳

ایک مشک بردوش پیاسا

گرمی کا زمانہ تھا۔ دھوپ کی شدت، خشک سالی اور گرانی کی وجہ سے مدینے کے لوگوں کی زندگی دوبھر ہو چکی تھی۔ لوگ ہر وقت آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتے تھے کہ کاش بارش ہو جائے تو انھیں سکون کی سانس لینے کا موقع مل سکے۔ اسی زمانے میں اچانک رسول اکرمؐ کو یہ خبر ملی کہ شمال مشرق کی جانب زندگی بسر کرتے والے مسلمانوں کو رومیوں سے زبردست خطرہ ہے۔ روم کی فوج کسی وقت بھی ان مسلمانوں کی جان کے لیے خطرناک صورت حال پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تمام شہریوں کو حکم دیا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیئے فوراً آمادہ ہو جائیں۔ خشک سالی نے مدینے کے لوگوں کو پہلے ہی بری طرح پریشان کر رکھا تھا اور ہر آدمی کی دلی خواہش تھی کہ نئی فصل کے میوے کھائیں۔ خشک سالی کے زمانے میں تازہ پھلوں کو چھوڑ کر چلچلاتی دھوپ اور گرم ہوا کے تھپیڑوں

میں مدینے سے شام کا سفر طے کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے حالات میں منافقوں کے لیے عہد شکنی کا ماحول پوری طرح سازگار تھا۔

لیکن شدید گرمی، لو دھوپ کی شدت، خشک سالی اور منافقوں کی وعدہ خلافی سپاہیان اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکی۔

اور تقریباً تیس ہزار مسلمانوں پر مشتمل سپاہ اسلام رومیوں کے احتمالی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے شام کی جانب روانہ ہو گئی۔

جنگل کا راستہ تھا۔ آفتاب ان لوگوں پر آگ برسا رہا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ کھانے پینے کا زیادہ سامان بھی نہ تھا بلکہ اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ کہیں سپاہیان اسلام کو کھانے پینے کی چیزوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ بعض کوتاہ ایمان مسلمانوں نے راستے ہی میں ساتھ چھوڑ دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد کعب ابن مالک مدینے کی طرف لوٹ پڑا۔ اصحاب نے رسول خداؐ سے کہا۔ یا رسولؐ اللہ! کعب ابن مالک ہم لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر مدینہ واپس چلا گیا۔" انھوں نے جواب دیا "اسے جانے دو۔ اگر اسمیں ذرہ برابر نیکی پائی جاتی ہے تو خداوند عالم بہت جلد اسے تم لوگوں کے پاس واپس بھیج دے گا۔ اور اگر اس میں کوئی نیکی نہیں پائی جاتی تو سمجھو کہ پروردگار نے تم لوگوں کو اس کے شر سے نجات عطا کر دی۔"

کچھ ہی دیر بعد اصحاب رسولؐ نے بتایا "یا رسولؐ اللہ! کرارہ بن ربیع بھی لشکر اسلام کا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے گئے۔" رسول مقبولؐ نے

ارشاد فرمایا "دیکھو اگر اس میں ذرہ برابر نیکی پائی جاتی ہے تو پروردگار اسے جلد ہی تم لوگوں سے دوبارہ ملا دے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لو کہ پروردگار عالم نے تم لوگوں کو اس کے شر سے چھٹکارا دلایا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد لوگوں نے پھر اطلاع دی "یا رسول اللہؐ! ہلال بن امیہ بھی واپس چلے گئے۔" رسولؐ مقبول نے پھر ان لوگوں کو وہی جواب دیا اور سب خاموش ہو گئے۔

اسی اثنا میں ابوذر کا اونٹ ایک جگہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ابوذر نے ہر ممکن کوشش کی قافلے کا ساتھ نہ چھوٹنے پائے مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اچانک اصحاب کو احساس ہوا کہ ابوذر قافلے کے ساتھ نہیں ہیں چنانچہ وہ لوگ خدمت رسولؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "یا رسول اللہؐ! ابوذر بھی واپس چلے گئے۔" رسول اکرمؐ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "جانے دو اگر ان میں کوئی نیکی پائی جاتی ہے تو پروردگار انھیں تم لوگوں سے پھر ملحق کر دے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو سمجھ لو کہ پروردگار عالم نے تم لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ کر دیا ہے۔"

ادھر ابوذر نے ہر ممکن کوشش کی مگر ان کا اونٹ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ مجبوراً وہ اپنی سواری سے نیچے اترے اور سامان سفر اپنے کندھوں پر لاد کر پیدل ہی چل پڑے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے ان کا دل و دماغ قابو میں نہ تھا اور پیاس کی وجہ سے ان کی زبان باہر نکلی آرہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے اور انھیں سوائے

اس بات کے اور کچھ یاد نہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح پیغمبر کی خدمت میں پہونچ کر لشکر اسلام کے ساتھ ہو جائیں۔ بہرحال وہ تیز قدموں سے راستہ طے کرتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک آسمان کے ایک گوشے میں انھیں کچھ بادل نظر آئے جسے دیکھ کر ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ وہ اس طرف مڑ گئے ناگہاں ان کا پیر ایک بھاری پتھر سے ٹکرایا اور انھوں نے دیکھا کہ اس جگہ پر بارش کا پانی جمع ہے۔ انھوں نے تھوڑا سا پانی چکھا اور پوری پیاس بجھائے بغیر ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور سوچا کہ کہیں پیغمبر اسلام پیاسے نہ ہوں۔ لہٰذا انھوں نے کندھے سے خالی مشک اتاری اور وہ پانی مشک میں بھر لیا اور اسے کندھے پر لاکر چل پڑے۔ گرمی کی شدت سے ان کا جگر کباب ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ نہایت بلند حوصلگی کے ساتھ راہ کی پستی اور بلندی کو طے کرتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد انھیں لشکر اسلام کی کچھ جھلک سی نظر آئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی رفتار میں بھی غیر معمولی تیزی آگئی۔

ادھر لشکر اسلام کے ایک سپاہی نے بھی دیکھ لیا کہ کوئی شخص تیز قدموں سے ان لوگوں کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا "یا رسول اللہ! ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی شخص ہم لوگوں کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے" رسول اکرمؐ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اے کاش! وہ ابوذر ہوں۔" سایہ نزدیک آتا چلا گیا۔

لوگوں نے دیکھا اور خوشی سے چلا اٹھے: "خدا کی قسم آنے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ابوذر ہی ہیں۔"

رسول اکرم: "اے پروردگار! ابوذر کو بخش دے۔ وہ ایک بے مثال شخص ہیں۔"

غرضکہ رسول مقبول نے ابوذر کا استقبال کیا۔ سارا سامان انکی پیٹھ سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور ابوذر زبردست تھکاوٹ کی وجہ سے زمین پر گر پڑے۔

رسول اکرم نے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "جلدی پانی لاؤ۔ ابوذر نے کہا: "یا رسول اللہ! پانی میرے ساتھ ہے۔"

"پانی تمہارے ساتھ موجود تھا پھر بھی تم نے اپنی پیاس نہیں بجھائی؟"

"یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔ راستے میں ایک جگہ میں ایک بھاری پتھر سے ٹکرا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس جگہ کچھ پانی جمع ہے۔ میں نے اسے چکھ کر دیکھا تو پانی اچھا تھا۔ میں نے سوچا کہ رسول خدا کو پلائے بغیر میں اس پانی سے اپنی پیاس نہ بجھاؤں گا۔"[1]

---

[1] ابوذر غفاری۔ تالیف عبدالحمید جودۃ السحار (ترجمۂ علی شریعتی با اضافات)

(۴۳)

مرتے ہوئے کو مارنا

عبدالملک بن مروان اپنی ۲۱ سالہ ظالمانہ حکومت کے بعد ۸۶ھ میں اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ولید حاکم وقت قرار پایا۔ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے کے بعد ولید نے یہ فیصلہ کیا کہ عوام میں پھیلی ہوئی ناراضگی اور حکومت کے خلاف بھڑکے ہوئے عوامی جذبات کو کم کرنے کے لئے وہ لوگوں کے ساتھ کچھ نرمی اور خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کرے تاکہ عوام نفرت اور بیزاری کے بجائے حکومت کی حمایت کرنے لگیں۔ خصوصاً اہل مدینہ کے ساتھ اس نے غیرمعمولی حسن سلوک کا فیصلہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آج بھی اس مقدس شہر میں اصحاب رسول اور بے شمار اہل فقہ و اہل حدیث موجود تھے۔ اور اس شہر کو ایک خصوصی تقدس بھی حاصل رہا ہے۔ چنانچہ اس نے حاکم مدینہ ھشام بن اسماعیل مخزومی کو جس کی ظالمانہ روش سے تمام اہل مدینہ بے حد پریشان تھے اور ہر آدمی کی خواہش تھی کہ خدا اس مفسد کو

نیست و نابود کر دے، اس کے عہدۂ گورنری سے برطرف کر دیا۔ واضح رہے کہ ھشام ولید کا نانا تھا۔

ھشام بن اسماعیل نے اہل مدینہ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی تھی اور ان پر بے پناہ مظالم بھی ڈھائے تھے۔ مشہور و معروف محدث سعید بن مسیب تمام اہل مدینہ کے درمیان ایک محترم شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے ہشام کی بیعت سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں اس نے ابن مسیب کو ساٹھ کوڑے لگائے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تازیانہ لگانے کے بعد انھیں ایک موٹے کپڑے میں لپیٹ کر مدینے کے باہر جنگل میں پھنکوا دیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے چاہنے والوں کے ساتھ اور خصوصاً علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ تو اس نے غیر انسانی مظالم کی انتہا کر رکھی تھی۔

غرض کہ ولید نے ھشام کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ پر اپنے نوجوان چچا زاد بھائی عمر بن عبد العزیز کو مدینے کا گورنر مقرر کر دیا۔ لوگ عمر ابن عبد العزیز کی دیانت داری اور انصاف پسندی سے بہت متاثر تھے۔ عمر ابن عبد العزیز نے گورنر کا عہدہ سنبھالتے ہی حکم دیا کہ ھشام کو مروان حکم کے گھر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اور لوگوں میں منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کے ساتھ ہشام نے اپنے دور اقتدار میں ظلم اور ناانصافی کے ساتھ کام لیا ہو وہ آ کر ان مظالم اور بدسلوکیوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ چنانچہ لوگ جوق در جوق آنے لگے اور ہشام بن اسماعیل پر گالیوں اور

لعنتوں کی بارش ہونے لگی۔

لیکن خود ہشام بن اسماعیل کو علی بن الحسینؑ اور ان کے چاہنے والوں سے زیادہ خطرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے امام زین العابدینؑ اور ان کے ساتھیوں پر جو مظالم کئے تھے اور آل رسول کی شان میں جو گستاخیاں کی تھیں۔ اس کے قصاص کی صورت میں ہشام کو بخوبی علم تھا کہ قتل کے علاوہ کوئی دوسری مناسب سزا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا کہ کہیں حضرت زین العابدین انتقام لینے نہ آجائیں۔ ادھر امام زین العابدین نے اپنے چاہنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مرے ہوئے کو مارنا ہماری عادت اور سیرت کے بالکل برعکس ہے۔ ہم لوگ دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انتقام نہیں لیا کرتے۔ بلکہ ہماری سیرت تو یہ رہی ہے کہ گرے ہوئے کو سہلا دیں اور اس کی ہر ممکن مدد کریں۔" جس وقت امام زین العابدینؑ اپنے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ کے ساتھ ہشام بن اسماعیل کی طرف بڑھ رہے تھے تو ان لوگوں کو آتا ہوا دیکھ کر ہشام کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ عنقریب وہ موت کی گودی میں پہونچ جائے گا۔ لیکن اس کی امید کے خلاف امام زین العابدینؑ نے اس کے قریب پہونچتے ہی نہایت بلند آواز میں ارشاد فرمایا: "سلام علیکم" اس کے بعد نہایت شفقت و محبت کے ساتھ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "میں تیری ہر ممکن مدد کیلئے حاضر ہوں۔" اس واقعہ کے بعد مدینے کے لوگوں نے بھی ہشام سے کسی قسم کا کوئی انتقام نہ لیا۔[1]

[1] بحار الانوار جلد ۱۱، ص ۱۷، ۲۷ - الامام الصادق، جلد ۱، ص ۱۱۱
الامام زین العابدین تالیف عبد العزیز سید الاہل ترجمہ حسین دہدانی ص ۹۲

(۵۷)

انجان آدمی

ایک بے سہارا عورت کندھے پر مشک اٹھائے ہوئے ہانپتی کانپتی اپنے گھر کی طرف چلی جارہی تھی۔ راستے میں ایک انجان آدمی نے اس بے سہارا عورت سے مشک لیکر اپنے کندھے پر رکھ لی اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ چھوٹے چھوٹے بچے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے ماں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ان معصوم بچوں نے دیکھا کہ ایک انجان آدمی بھی ان کی والدہ کے ساتھ گھر کی طرف آرہا ہے اور پانی کی مشک اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے ہے۔ گھر پہونچ کر اس انجان آدمی نے مشک کو زمین پر رکھتے ہوئے اس عورت سے پوچھا: "تمہاری حالت کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمھارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اس طرح بے سہارا کیسے ہو گئیں؟"

"میرا شوہر ایک بہادر سپاہی تھا۔ علی بن ابی طالبؑ نے اسے لشکر اسلام

کے ساتھ محاذ جنگ پر بھیج دیا تھا۔ جنگ کے دوران میرا شوہر مارا گیا اور اب ان کمسن بچوں کے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

اس انجان آدمی نے دوبارہ اپنی زبان سے کچھ نہ کہا بلکہ گردن جھکائی اور گھر کے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ انجان آدمی ہمہ وقت اس بے سہارا عورت اور معصوم بچوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ رات میں اسے نیند نہ آئی۔ چنانچہ صبح سویرے اس نے ایک تھیلے میں گوشت، آٹا، خرما اور کھانے پینے کا دوسرا سامان رکھا اور اس بے سہارا عورت کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازہ پر پہونچکر اس نے آواز دی۔ عورت نے دریافت کیا "تو کون ہے؟"

"میں وہی بندۂ خدا ہوں جو کل پانی کی مشک لے کر تمہارے ساتھ آیا تھا۔ آج میں بچوں کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر آیا ہوں"

"اے بندۂ خدا! پروردگار تیرا بھلا کرے۔ ہمارے اور علی بن ابیطالب کے درمیان خداوند عالم ہی فیصلہ کرے گا۔"

دروازہ کھلا اور انجان آدمی گھر کے اندر داخل ہوا۔ کھانے پینے کی چیزیں اس عورت کے سپرد کرتے ہوئے کہنے لگا "میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ ثواب کا کام انجام دوں۔ لہٰذا اگر تم اجازت دو تو آٹا خمیر کرکے روٹی پکا دوں یا پھر میں ان بچوں کی دیکھ بھال کرتا رہوں اور تم روٹی تیار کر لو۔"

"بہت اچھا میں آٹا خمیر کرکے روٹی پکاتی ہوں۔ تم ان بچوں کی دیکھ بھال

کرتے رہو۔"

غرضکہ وہ عورت آٹا خمیر کرنے میں مشغول ہوگئی۔ اس انجان آدمی نے تھیلے سے گوشت نکال کر اسے فوراً کباب کیا اور اپنے ہاتھوں سے ان یتیم بچوں کو خرما اور کباب کھلانے لگا۔ اپنے ہاتھوں سے خرما اور کباب کھلاتے وقت وہ انجان آدمی ان بچوں سے یہی کہتا جا رہا تھا۔ "میرے بچو! علی بن ابیطالب کو معاف کر دو اگرچہ انھوں نے تمھارے معاملے میں کوتاہی کی ہے۔"

اسی اثنا میں خمیر آمادہ ہوگیا۔ اس عورت نے آواز لگائی۔ "بندۂ خدا خمیر تیار ہوگیا ہے تنور روشن کر دے۔"

اس انجان آدمی نے فوراً ہی تنور روشن کر دیا اور آگ کی لپٹ تنور سے باہر نکلنے لگی۔ انجان آدمی اپنا چہرہ آگ کے قریب لیجا کر اپنے آپ سے یوں مخاطب ہوا۔ "آگ کی حرارت کا مزہ چکھ لے یتیموں اور بیوہ عورتوں کے معاملے میں کوتاہی کرنے والوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔"

ابھی وہ اسی عالم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پڑوسن اس عورت کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے اس انجان آدمی کو پہچان لیا اور اس عورت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "وائی ہو تجھ پر۔ کیا تو اس آدمی کو نہیں پہچانتی اور اس سے اس طرح کا کام لے رہی ہے۔ یہ امیرالمومنین علی بن ابیطالب ہیں۔"

وہ بے سہارا عورت سامنے آئی اور کہنے لگی۔ "میں اپنی حرکت

پر بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔ میں تجھ سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ میں نے تیرے معاملے میں کوتاہی سے کام لیا ہے۔"[۱]

---

[۱] بحار الانوار ، جلد ۷ ، باب ۱۰۳ ص ۵۹۷

= جلد اوّل تمام شد =

maablib.org

سازمان تبليغات اسلامى
روابط بين‌الملل
تهران ص. ب. ۱۱۳۶۵/۷۳۱۸
جمهورى اسلامى ايران

بها: ۲۰۰ ريال

maablib.org